مارچ ۱۹۹۱ء

ماہنامہ

# میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر ۱

## عزمِ تنظیم سابقہ سرافگندیم

امیر تنظیم اسلامی کی ۱۹۸۷ء کی وہ تقریر جس میں انہوں نے تنظیم اسلامی کے قیام کے عزم کا اظہار کیا تھا

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

## تنظیم اسلامی کے سولہویں سالانہ اجتماع کے موقع پر امیرِ تنظیم کا پیغام:

یہ کتابُ اللہ کا پیغام ہے
"اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ" یاد رکھ!

○

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا
ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ
وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ

# ھُوَ اجْتَبٰکُمْ

○

## ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو!

یہ درندے خدا کی دھرتی کو — کلدیا[1] کی غریب بستی کو
ناگاساکی بنا کے چھوڑیں گے — ہیروشیما بنا کے چھوڑیں گے
جنگ بازوں کا ملک گیروں کا — قافلہ تیز گام ہے کتنا!

## اور بھی قافلے کو تیز کرو!!

جنگ کے دیوتا کے سینے پر — چڑھ کے لہرا دو امن[2] کا پرچم!

[1] عراق کا قدیم نام کالدیا ہے۔
[2] امن صرف ایمان سے ہے، اور سلامتی کی واحد راہ اسلام ہے!

○

تنظیم کے سالانہ اجتماع کے موقع پر آئندہ سال کے لیے وہی دعا کیجیے
جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نئے چاند کو دیکھ کر کیا کرتے تھے:

# اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ
# وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ

اسرار احمد

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔


جلد: ۴۰
شمارہ: ۳
شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ
مارچ ۱۹۹۱ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-


# ماہنامہ میثاق لاہور


مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد


## مشمولات


- عرضِ احوال ——— ۲
  ——— عاکف سعید
- عزمِ تنظیم ——— ۵
  ——— ڈاکٹر اسرار احمد
- سالانہ اجتماع کا الوداعی تحفہ ——— ۶۵
  ——— از طرف: ڈاکٹر اسرار احمد
- جماعتِ اسلامی کی موجودہ تنظیمی کیفیت ——— ۷۳
  ——— نعیم صدیقی
- خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز ——— ۸۱



ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر



مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰- فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرض احوال

تنظیم اسلامی کا سولہواں سالانہ اجتماع بحمداللہ حسب پروگرام ۲۲ تا ۲۵ر فروری قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوا۔ بہت سے اعتبارات سے یہ ایک بھرپور اور کامیاب اجتماع تھا بالخصوص نظم و ضبط اور حسنِ انتظام کے اعتبار سے یہ ایک مثالی اجتماع تھا۔

اجتماع کا آغاز طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۲ر فروری کو ساڑھے گیارہ بجے امیرِ تنظیم اسلامی کے خطابِ جمعہ سے ہوا۔ دورانِ اجتماع امیر تنظیم کے خطابات عام کے مزید دو پروگرام ہوئے۔ ایک پروگرام ۲۳ر کی شام کو تھا جس میں امیر محترم نے "فرائضِ دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر اپنی ایک مختصر لیکن نہایت جامع تحریر کا مطالعہ کرایا اور اس کے مضمرات و مقدرات کو کھول کر بیان کیا۔ ۲۴ کی شام کو دوسرے پروگرام میں امیر تنظیم نے 'منہجِ انقلابِ نبوی' کے موضوع پر اپنا حاصلِ مطالعہ نہایت واضح اور دو ٹوک انداز میں شرکاء کے سامنے رکھا۔ تین گھنٹوں پر محیط اپنے خطاب میں امیر محترم نے موضوع سے متعلق تمام گوشوں کو نہایت جامعیت کے ساتھ سمو کر پیش کیا ——— اس اجتماع کا بڑا حصہ منتخب نصاب نمبر ۲ کے قرآنی دروس پر مشتمل تھا۔ اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ تمام دروس تنظیم اسلامی کے قافلے میں شریک نوجوان ساتھیوں نے دیئے اور امیر تنظیم نے ان دروس میں بطور سامع شرکت کی۔

اس سالانہ اجتماع سے متعلق کسی قدر تفصیلی مواد 'ندا' کے تازہ پرچے میں جس پر ۱۵ر مارچ کی تاریخ درج ہے' شامل ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ 'میثاق' کے زیرِ نظر شمارے میں ان تمام رپورٹوں کو شائع کیا جائے گا جو دورانِ اجتماع مختلف علاقوں کے امراء نے پیش کیں۔ ان رپورٹوں کے ذریعے تنظیم اسلامی کی سال بھر کی کارگزاری کا ایک جامع اور متوازن خاکہ سامنے آتا ہے۔ ع "جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں"۔ لیکن اس طرح اندیشہ تھا کہ پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہو جاتی۔ چنانچہ رپورٹوں کی اشاعت کو آئندہ شمارے کے لئے ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تاہم رفقائے تنظیم کے نام امیر تنظیم کے اس پیغام کو سرورق کے اندرونی صفحے پر شائع کیا جا رہا

ہے جو اس سالانہ اجتماع کے موقع پر تنظیم کی جانب سے تقسیم کئے جانے والے ایک پمفلٹ میں شامل تھا۔ اسی طرح امیر تنظیم کے اختتامی خطاب کا آخری حصہ بھی اس شمارے میں شامل ہے جو سورۃ الاعراف کی دو آیات کے ترجمہ و تشریح پر مشتمل تھا۔ یہ گویا امیر تنظیم کی جانب سے وہ الوداعی تحفہ تھا جو اجتماع کے اختتام پر رفقاء کی نذر کیا گیا۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے' ٹھکانے لگا دے اسے

---

زیر نظر شمارہ سالانہ اجتماع ہی کی مناسبت سے امیر تنظیم اسلامی کے اس تاریخی خطاب پر مشتمل ہے جس میں آج سے سترہ برس قبل امیرِ تنظیم نے تنظیم اسلامی کے قیام کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۷۴ء کے موسم گرما میں لاہور کے وسط میں واقع مسلم ماڈل سکول اردو بازار میں ایک اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ منعقد ہوئی تھی۔ اس تربیت گاہ کا اختتامی خطاب تنظیم اسلامی کے قیام کی تمہید ثابت ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کی باقاعدہ تأسیس دراصل اسی خطاب کی صدائے بازگشت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ خطاب اس سے قبل ' سراگندیم' نامی کتابچے میں شامل تھا جو آؤٹ آف سٹاک ہونے کے باعث ایک عرصے سے مفقود تھا۔ آئندہ یہ خطاب "سلسلۂ اشاعتِ تنظیم اسلامی نمبر1" کی حیثیت سے 'عزمِ تنظیم' کے نام سے طبع ہوگا۔ سردست یہ مکمل خطاب نئی کمپیوٹر کتابت کے ساتھ اس شمارے میں شامل ہے۔ تنظیم اسلامی کے مؤسس اور امیر کے شخصی تعارف اور ان کے ذہنی و فکری پسِ منظر کو جاننے اور اس حوالے سے تنظیمِ اسلامی کی فکری اساس کو سمجھنے کے لئے یہ خطاب ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

میثاق کے پچھلے شمارے میں قرآن کالج کی ایف اے کلاس میں نئے داخلوں کے بارے میں یہ اعلان قارئین کی نظر سے گزرا ہوگا کہ میٹرک کے رزلٹ کا انتظار کئے بغیر رمضان المبارک کے فوراً بعد طلبہ کو داخلہ دے دیا جائے گا' تاکہ طلبہ کو فرسٹ ایئر کے بورڈ کے امتحانات کی تیاری کرانے کے لئے قدرے زائد وقت ہمیں مل سکے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ قارئین کو یہ اطلاع دینی ہے کہ اس پروگرام میں بوجوہ ایک بڑی تبدیلی

کی گئی ہے جو سطورِ ذیل میں مذکور ہے۔

پچھلی کسی اشاعت میں یہ بات وضاحت سے عرض کی جا چکی ہے کہ بورڈ کا یہ حالیہ فیصلہ کہ ایف اے فرسٹ ائر اور سیکنڈ ائر کے امتحانات آئندہ سے جدا جدا ہوا کریں گے' ہمارے لئے خاصی دشواری کا باعث بنا ہے۔ قرآن کالج کے طلبہ کے لئے ہم نے عربی زبان کو بطور ایک مستقل مضمون کے لازمی قرار دیا ہے اور دقت یہ ہے کہ کالج میں داخلے کے امیدوار طلبہ کی اکثریت عربی زبان کے حروف تہجی سے بھی ناواقف ہوتی ہے۔ آئندہ فرسٹ ائر میں داخلے کے صرف سات آٹھ ماہ کے بعد ہی فرسٹ ائر کا بورڈ کا امتحان درپیش ہوگا۔ اتنی مختصر مدت میں طلبہ کو عربی زبان کی اتنی استعداد بہم پہنچا دینا کہ وہ ایف اے کی سطح کے امتحان میں شریک ہو سکیں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ویسے عربی تو ایک طرف رہی میٹرک پاس طلبہ کی انگریزی کا حال بھی کچھ کم تشویشناک نہیں ہوتا۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ سکولوں میں کئی سال انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اکثر طلبہ انگریزی گرامر کے بالکل ابتدائی اصولوں سے بھی ناواقف محض ہوتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں بالعموم معیار تعلیم اتنا گر چکا ہے کہ میٹرک پاس طلبہ کی اکثریت میں چھٹی جماعت کے طلبہ جتنی لیاقت بھی مفقود نظر آتی ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مزید سوچ بچار اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ قرآن کالج میں ایف اے کے طلبہ کو بی اے کے طلبہ کی طرح ایک سال اضافی لگانا ہوگا۔ اس اضافی سال میں ہم طلبہ کو عربی اور انگریزی ہی نہیں اردو زبان بھی پڑھائیں گے تاکہ ان میں فی الواقع اتنی لیاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ایف اے کے امتحانات محض نصاب کو رٹ کر نہیں' اپنی قابلیت کے بل پر اچھے نمبروں میں پاس کر سکیں اور تاکہ مستقبل میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ایک ٹھوس بنیاد انہیں حاصل ہو سکے۔ چنانچہ آئندہ سے قرآن کالج میں ایف اے کی تعلیم دو سالوں کی بجائے تین سالوں میں مکمل ہوگی تاہم پھر بی اے کے لئے طلبہ کا مزید کوئی اضافی سال صرف نہیں ہوگا بلکہ ایف اے کے بعد دو ہی سالوں میں قرآن کالج کے طلبہ بی اے کی تکمیل کر سکیں گے۔ گویا ایک میٹرک پاس طالب علم کو قرآن کالج میں بی اے کرنے کے لئے کل پانچ سال درکار ہوں گے۔ اس پانچ سال کے عرصے میں وہ بی اے کے معمول کے نصاب کے علاوہ دینی تعلیم کا ایک متعین نصاب بھی مکمل کرے گا اور ہمیں امید ہے کہ قرآن کالج میں بی اے تک

(باقی صفحہ پر)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

# سرافگندیم

بِسْمِ اللّٰهِ

مَجْرٖىهَا

وَمُرْسٰهَا

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۚ وَاذْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ
مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ وَ
لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ وَ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ ﴿١٠٥﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ
فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۗ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا
عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿١٠٩﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ مِنْهُمُ
الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ؐ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارا قرآنی تربیت گاہ کا پروگرام بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ اگرچہ اس بار ابتدا میں کچھ بددلی کا سامنا رہا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اچانک کچھ انتظامی دشواریاں پیش آ گئیں اور دوسرے موسم کی سختی اور خصوصاً برقی رو کی آنکھ مچولی کے باعث' تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کچھ تو رفتہ رفتہ انتظامات درست ہوگئے' کچھ آپ حضرات نے ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!" کے مصداق موسم کے ساتھ سازگاری اختیار کرلی اور کچھ ہم نے پروگرام میں تخفیف کرتے ہوئے ایک ماہ کے بجائے تین ہفتوں پر اکتفا کرلیا۔ بہرحال بفضل اللہ تعالیٰ وعونہٖ پروگرام پورا ہوگیا۔ گویا ع "شکر' صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!"

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس تربیت گاہ کے پروگراموں میں مرکزی حیثیت مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے درس کو حاصل تھی جس کا آغاز یکم جولائی کو سورۃ العصر سے ہوا تھا اور اختتام آج سورۃ الحدید پر ہوا ہے اور جس کے بارے میں مَیں نے آغاز میں بھی عرض کردیا تھا اور بعد میں بھی متعدّد بار واضح کیا کہ اس کی ترتیب میں اصل مقصد یہ پیش نظر رہا ہے کہ ہمارے سامنے اللہ کے دین کا ایک صحیح' ہمہ گیر اور جامع تصور بھی آ جائے اور ہم پر اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بھی منکشف ہو جائیں۔

گویا ہم پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہمارا دین ہے کیا؟ اور یہ بھی منکشف ہو جائے کہ وہ ہم سے چاہتا کیا ہے!!

اور آج اس نصاب کی تکمیل کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ اتفاق فرمائیں گے کہ تربیتی پروگرام کے دوسرے حصوں میں چاہے کوئی کمی رہ گئی ہو' جہاں

تک اس بنیادی مقصد کا تعلق ہے وہ بتمام و کمال نہ سہی ضروری حد تک بہرحال پورا ہوگیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ واضح ہوگیا ہے کہ ہمارا دین عام مذہبی تصوّرات کے مطابق صرف چند عقائد اور رسوم کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشے پر عمل داری کا طالب ہے اور اپنے ماننے والوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اولاً وہ اسے خود اپنی زندگیوں میں بتمام و کمال رائج کریں اور پھر اسے ہیئتِ اجتماعیہ حتیٰ کہ پورے کرۂ ارضی پر نافذ و غالب کرنے کی کوشش کریں اور اس میں تن من دھن سب کچھ کھپا دیں۔ اور دوسری طرف اس نہ صرف محدود بلکہ مسخ شدہ (Perverted) تصوّرِ دین کی غلطی بھی پوری طرح واضح ہوگئی ہے جس نے امّتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت کے قویٰ شل کر دیئے ہیں اور اسے بحیثیتِ مجموعی جمود اور تعطّل کا شکار بنا کر رکھ دیا ہے!

اب ظاہر ہے کہ اصل مسئلہ نیت اور ارادے کا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ "سوتے کو جگایا جا سکتا ہے' جاگتے کو جگانا ممکن نہیں!" اگر کوئی سمجھنے کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو تو بات دوسری ہے' لیکن اگر کوئی واقعۃً جاننا چاہے کہ ازروئے قرآن انسان کی نجات کے ناگزیر لوازم کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں فوز و فلاح سے ہمکنار ہونے اور عفو و درگزر کے مستحق قرار پانے کی کم از کم شرائط کیا ہیں تو اس کے لئے اجمالاً سورۃ العصر بھی کفایت کرتی ہے اور تفصیلاً یہ پورا نصاب تو حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد اب اصل مسئلہ 'عمل' کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی مرحلہ سب سے کٹھن ہے۔ اور اصل دشواری یہیں پیش آتی ہے۔ اور یہی وہ معاملہ ہے جس سے متعلق اپنی زندگی کے ایک اہم فیصلے کے اظہار و اعلان اور اس کے پس منظر کی وضاحت کے لئے میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔

اس سے پیشتر کہ میں وہ فیصلہ آپ حضرات کے سامنے رکھوں' اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میرے اب تک کے کام کی نوعیت صرف درس و تدریس کی

رہی ہے نہ کہ کسی ہمہ گیر دعوت کی! اور میں یہ بات مسلسل واضح کرتا رہا ہوں کہ میری حیثیت اصلاً صرف ایک طالبعلم کی اور زیادہ سے زیادہ ایک مدرّس یا معلّم کی ہے نہ کہ داعی یا مبلّغ کی!

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطباتِ مبارکہ میں ایک جملہ آتا ہے۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے: "اُوْصِیْکُمْ وَنَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰہِ" یعنی میں تمہیں بھی تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی! میں اپنے لئے تو وصیت یا نصیحت کا لفظ بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ میرے اب تک کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم قرآن کی نوعیت محض یہ رہی ہے کہ میرے نزدیک ازروئے قرآن ہر مسلمان پر اس کے دین کی جانب سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ یہ ہیں جو میں آپ حضرات کو بھی بتا رہا ہوں اور خود اپنے آپ کو بھی! ہم سب حسبِ صلاحیت و استعداد ان پر مکلّف بھی ہیں اور عند اللہ مسئول اور جوابدہ بھی! اور ہمیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرنی چاہئے!

مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ راہ یوں تو ویسے بھی بڑی کٹھن اور پُرصعوبت ہے اور اس پر چلنے کے لئے "چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس!" اس لئے کہ بفحوائے آیۂ قرآنی " اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ "بے شک یہ بہت ہمت کے کاموں میں سے ہے! لیکن اس میں پہل کرنے والا تو گویا ایک بہت ہی بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ہے اور" اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ " اور " اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ "کہتے ہوئے اس پُرخطر وادی میں اتر جانا اور پھر پکارنا کہ" مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ!" (کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟) ہرگز کوئی آسان کام نہیں!

یہی وجہ ہے کہ تاحال میں 'درس و تدریس' کے گوشۂ عافیت ہی میں پناہ گزیں رہا اور میں نے یہی موقف اختیار کئے رکھا کہ دین کی یہ حقیقت ہے جو مطالعۂ قرآن سے مجھ پر واضح ہوئی اور دین کے یہ فرائض ہیں جو کلامِ الٰہی سے مجھ پر منکشف

ہوئے۔ میں اس کا مدّعی نہیں کہ میں خود ان کو بجا لا رہا ہوں اور آپ کو دعوت دے رہا ہوں کہ ان کی ادائیگی میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بلکہ مقصود محض اظہارِ حقیقت ہے' اس خیال سے کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ میں سے کسی کو اس خدمت کے لئے قبول فرمالے اور سامعین میں سے کوئی باصلاحیت اور باہمت شخص ایسا نکل آئے جو اٹھ کھڑا ہو اور خلقِ خدا کو دعوت دے کہ "اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ!" اللہ کے بندو میری طرف آؤ! اور اس طرح راہ حق پر چلنے کے لئے ایک قافلہ تیار ہو جائے۔

لیکن اب بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق پر توکّل و اعتماد اور صرف اُسی کی امداد و اعانت کے سہارے اور بھروسے پر میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں یہ کام صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہے گا' بلکہ انشاء اللہ العزیز احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق ہی عملاً میری زندگی کا اصل مقصد ہوں گے اور میری بہتر اور بیشتر مساعی بالفعل دعوتِ دین اور خلقِ خدا پر دینِ حق کی جانب سے اتمامِ حجّت میں صرف ہوں گی۔ گویا "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اور اسی کی دعوت میں اپنے تمام عزیزوں' دوستوں اور تمام جاننے والوں حتیٰ کہ بزرگوں تک کو دوں گا اور پھر جو لوگ اس راستے پر ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں انہیں ایک نظم میں منسلک کر کے ایک ہیئتِ اجتماعیہ تشکیل دوں گا جو ان مقاصدِ عالیہ کے لئے منظم جدّوجہد کرسکے! وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ!

میں نے یہ فیصلہ دفعتہً نہیں کرلیا ہے بلکہ اس کا ایک طویل پس منظر ہے۔ اور چونکہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کرنے کا

خواہش مند نہیں ہوں کہ جیسے یہ حقیقت بس مجھ ہی پر منکشف ہوئی ہے یا یہ کوئی 'وحی' ہے جو براہ راست مجھ ہی پر 'نازل' ہوئی ہے' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اجمالاً وہ پورا پس منظر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ میرے فکر کا پورا 'شجرۂ نسب' آپ کے علم میں آجائے۔

اس سلسلے میں یہ معذرت پیشگی حاضر ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں کوئی مرتّب مواد موجود نہیں ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ اکیس دن مجھ پر کس قدر سخت مشقّت کے گزرے ہیں' میری صحت پہلے ہفتے کے بعد ہی جواب دے گئی تھی اور بعد میں پندرہ دنوں کے دوران میں مَیں نہایت ثقیل بلکہ مضر ادویات کے سہارے اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جو میں نے اپنے ذمّے لے لیا تھا یعنی پورے منتخب نصاب کا درس اور خصوصاً آج کا دن تو بہت ہی سخت مشقت میں گزرا ہے۔ صبح کے اڑھائی گھنٹے اور عصر اور مغرب کے مابین ڈیڑھ گھنٹے کے درس کے بعد اب آپ مجھ سے کسی مرتّب تقریر کی توقع بہرحال نہ رکھیں۔ اس وقت میرا اصل مقصد تو صرف اس فیصلے کا اظہار و اعلان تھا' جو ہوگیا۔ جہاں تک اُس کے پسِ منظر کا تعلق ہے تو اس میں سے جو چیزیں اس وقت ذہن میں بلا تکلّف آجائیں' اور جن کی جانب اللہ تعالیٰ ذہن کو منتقل فرما دیں انہیں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے میری "بے ربطیٔ تقریر" میں بھی "ربطِ محکم" پیدا فرما دے!

میں ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبے حصار میں پیدا ہوا اور گورنمنٹ ہائی سکول حصار ہی سے میں نے ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ (میں نے کل ساڑھے آٹھ سو میں سے سات سو اٹھارہ نمبر لئے تھے اور یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن حاصل کی تھی!)

انسان کی عمر کے اِس دور کا اکثر حصہ تو ظاہر ہے کہ خالص بے شعوری کی حالت

میں گزرتا ہے۔ اس کے آخری حصے کو بھی زیادہ سے زیادہ نیم شعوری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے' تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں جو نقش لوحِ ذہن پر ثبت ہو جائیں وہ بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کے بالکل نا سمجھی کے دور میں بھی چونکہ اس فضا میں سانس لیا جس میں ہندو مسلم کشمکش کے سائے گہرے ہونے شروع ہو چکے تھے اور مسلمانانِ ہند اپنے قومی تشخّص کے تحفظ کے لئے جان توڑ کوشش پر مجبور ہو گئے تھے، لہٰذا میرے تحت الشعور کی سب سے نچلی سطح (Substratum) میں مسلم قوم پرستی کا جذبہ رچ بس گیا' یہاں تک کہ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جبکہ میری عمر کل چھ سال کی تھی میں نے علامہ اقبال مرحوم اور مصطفےٰ کمال پاشا کے انتقال کو نہ صرف ایک قومی نقصان بلکہ ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ 'نیم شعوری' کے دور کے آغاز پر میرے ذہن نے اولین اثرات علامہ اقبال مرحوم کی ملی شاعری سے قبول کئے۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میرے بڑے بھائی صاحب نے مجھے 'بانگِ درا' لا کر دی جسے میں گھنٹوں کچھ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے ترنّم کے ساتھ پڑھتا رہتا تھا۔

بانگِ درا کی نظموں میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند وہ تھیں جن میں ملتِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں ایک امید افزا نقشہ کھینچا گیا تھا اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور امتِ مرحوم کی تجدید کی خوشخبری دی گئی تھی اور فی الجملہ یہ رنگ موجود تھا کہ ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

خصوصاً طلوعِ اسلام کے یہ اشعار تو مجھے بے حد پسند تھے:

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!!

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

اور ان اشعار کو بھی میں بہت کیف اور سرور کے عالم میں پڑھا کرتا تھا۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا!

مولانا حالی سے اس دور میں میں قطعاً متعارف نہ ہوا تھا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ تاریخی اعتبار سے حالی کی 'مسدس' مسلمانانِ عالم کی پستی کی انتہا اور ملتِ اسلامی کے زوال و انحطاط اور نکبت و ادبار کے نقطۂ عروج سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پر مایوسی اور دل شکستگی کی گہری چھاپ ہے اور ان کی شاعری تمام تر مرثیہ خوانی پر مشتمل ہے جیسے:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

حالی اور اقبال ہم عصر بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں اور تاریخ ہائے وفات کے اعتبار سے ان کے مابین ایک نسل کا فاصلہ بھی ہے اور اسی 'وصل مع الفصل' اور 'جمع مع

الفرق' کی کیفیت ان کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ یعنی جہاں مولانا حالیؔ کے اشعار صرف مرثیہ خوانی پر مشتمل ہیں وہاں اقبال کے یہاں ماضی پر حد درجہ زوردار مرثیہ خوانی بھی ہے (ملاحظہ ہوں 'بانگ درا' کی نظمیں 'صقلیہ' اور 'بلادِ اسلامیہ') اور مستقبل کے لئے نہایت جذبات انگیز اور جذبہ پرور حُدی خوانی بھی!

بہرحال اپنی عمر کے نیم شعوری والے دور میں میرے ذہن پر اولین چھاپ علامہ اقبالؔ کی ملی شاعری کی پڑی اور اس سے احیائے دین اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملتِ

---

لہ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پانچویں جماعت کے دوران 'بانگِ درا' کو کچھ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے 'پی' جانے کے بعد میں نے چھٹی جماعت کے دوران 'بالِ جبریل' اور 'ضربِ کلیم' کو ایک صاحب سے عاریتہً لے کر پڑھ ڈالا اور ساتویں جماعت کے زمانے میں ایک لطیف سا بہانہ بنا کر بڑے بھائی صاحب سے 'بالِ جبریل' ، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' تینوں کتابیں حاصل کر لیں اور گویا علامہ مرحوم کا پورا اردو کلام نظر سے گزار لیا! 'ضربِ کلیم' اور 'بالِ جبریل' کو عاریتہً حاصل کرنے کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کی کتابوں کا مکمل سیٹ خان عزیز الدین حزئی کے یہاں موجود ہے جو حصار کے معروف وکلاء میں سے تھے۔ ان کا انتقال چند سال قبل ملتان میں ہوا۔ میں اپنے والد صاحب مرحوم و مغفور کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت وہ ایک عجیب سے شش و پنج میں مبتلا ہوگئے تھے کہ نہ انکار کئے بنتی تھی نہ طبیعت کتابیں دینے پر آمادہ ہوتی تھی۔ بالآخر انہوں نے ایک تدبیر سوچی اور علامہ کے ان اشعار کا مطلب مجھ سے دریافت کیا کہ ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!

اور کہا کہ اگر ان اشعار کا مفہوم بیان کر دو تو کتابیں لے جا سکتے ہو۔ پھر جب میں نے ان کا مفہوم بیان کر دیا تو وہ کچھ حیران سے تو ہوئے' تاہم انہوں نے کتابیں میرے حوالے کر دیں!

اسلامی کی تجدید اور تشکیلِ نو کا ایک جذبہ میرے قلب کی گہرائیوں میں رچ بس گیا۔

یہاں یہ اعتراف کرنا بھی مناسب ہے کہ اس جذبۂ ملّی کی آبیاری ایک زمانے میں حفیظ جالندھری صاحب کے 'شاہنامۂ اسلام' سے بھی ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جن دنوں مَیں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا میری ایک پوری رات 'شاہنامہ' کی دوسری جلد کو اس کے مخصوص طرزِ ترنّم میں پڑھ کر والدہ صاحبہ کو سنانے میں بسر ہوئی' اس طرح کہ اِدھر جلد ختم ہوئی اور اُدھر صبح نمودار ہوگئی!

۱۹۴۶-۴۷ء کے دوران مسلمانانِ ہند کی قومی جدّوجہد اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور پورے برصغیر کے مسلمانوں کے اعصاب پر تحریک مسلم لیگ کا کامل تسلّط تھا۔ چنانچہ میں بھی اپنی اسی نیم شعوری کیفیت میں پوری تندہی کے ساتھ اس سے وابستہ تھا۔ اس زمانے میں مَیں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک فعّال ورکر تھا اور اس دور میں ہمارے جذبۂ ملّی کے جوش و خروش کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم فیڈریشن کے کارکن روزنامہ 'نوائے وقت' کے استقبال کے لئے بالعموم ریلوے سٹیشن پہنچ جایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ مَیں حصار ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری بھی رہا اور ۱۹۴۶ء میں ایک بار میں نے لاہور میں منعقدہ فیڈریشن کے ایک مرکزی اجلاس میں ضلع حصار کے نمائندے کی حیثیت سے بھی شرکت کی!

تحریکِ مسلم لیگ کے ساتھ اس عملی تعلق بلکہ انہماک کے ساتھ ساتھ اُسی زمانے میں مَیں ایک نئی دعوت سے روشناس ہوا۔ یہ دعوت تھی مؤسّسِ جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی! جس نے میرے جذبۂ ملّی کو ایک نئی وسعت (Dimension) عطا کی اور دل میں تجدید و احیائے ملت کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی مقدّم اور پیشتر "تجدید و احیائے دین" کا جذبہ پیدا کیا۔ یا یوں کہہ لیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے عطا کردہ جذبہ ملّی کے خاکے میں ایک دینی فکر کا رنگ بھر دیا!

اپنے میٹرک کے زمانہ تعلیم کے دوران اگرچہ میں عملاً تحریک مسلم لیگ ہی سے

وابستہ رہا اور یہ نیا دینی فکر مجھ پر اس درجہ غالب نہ آسکا کہ میں عملاً بھی اسی کا ہو رہتا تاہم اس کا اثر مجھ پر اس حد تک ضرور ہوا کہ مسلم لیگ یا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے حلقوں میں جب بھی مولانا مودودی یا جماعت اسلامی پر کوئی تنقید ہوتی یا طنز و طعن کا معاملہ ہوتا تو میں ان کی جانب سے مدافعت میں پورا زور صرف کر دیتا۔

اس نئی دینی تحریک کے لٹریچر کے پڑھنے یا سمجھنے میں مجھے زیادہ دقّت اس لئے نہ ہوئی کہ میں نے سکول میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے عربی لی ہوئی تھی۔ اور ایک تو ویسے بھی میرا شمار سکول کے ذہین اور ہوشیار طلبہ میں تھا اور دوسرے عربی سے مجھے اللہ تعالیٰ نے خصوصی شغف عطا فرما دیا تھا' چنانچہ جماعت کی بنیادی دعوت پر مشتمل چھوٹے کتابچے میں نے تمام کے تمام جناب مسرت مرزا صاحب اور چوہدری نذیر احمد صاحب (یہ دونوں حضرات اب ملتان میں مقیم ہیں[1]!) سے حاصل کر کے پڑھ ڈالے اور ایک حد تک سمجھ بھی لئے۔ میرے بھائی اظہار احمد صاحب ان دنوں جماعت کا لٹریچر گہرے انہماک کے ساتھ پڑھ رہے تھے' یہاں تک کہ انہوں نے بہت سی کتابوں کے مفصّل نوٹس (Notes) بھی تیار کر لئے تھے۔

۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا۔ ۲۱/۲۰ اگست کو عید الفطر تھی اور اس کے دوسرے ہی روز سے حصار میں مسلمانوں کے محلوں پر ہندوؤں کے منظم حملے شروع ہو گئے اور ستمبر کا پورا مہینہ ہم لوگوں نے محصوری کے عالم میں بسر کیا۔

اسی محصوری کی حالت میں میں تفہیم القرآن سے پہلی بار متعارف ہوا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اُس زمانے میں' میں اور میرے بڑے بھائی' ہم دونوں محلے کی ایک مسجد میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' کے تازہ پرچوں سے تفسیر سورۂ یوسف پڑھا کرتے تھے۔ عام فہم تو ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ تھا' لیکن عربی میری بہتر تھی۔ اس طرح ہمارا اجتماعی مطالعہ بہت مفید بھی رہتا تھا اور دلچسپ بھی۔

---

[1] افسوس کہ اس دوران میں دونوں حضرات انتقال فرما گئے!

اور مجھے اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ میرے دل میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی رغبت اولاً اسی کے ذریعے پیدا ہوئی' بلکہ قرآن حکیم سے میرا اوّلین تعارف اسی کی وساطت سے ہوا.....!

اپنے میٹرک کے ان دو سالوں کے دوران میرا تعارف ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریروں سے بھی ہوا۔ ' الہلال ' کے بعض پرانے پرچے بھی دیکھنے میں آئے اور کتابی صورت میں مطبوعہ ' مضامینِ الہلال ' بھی میں نے پڑھے[1] اس سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ جس تحریک کا عَلَم اس وقت جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہے اور جو دعوت اس وقت مولانا مودودی پیش کر رہے ہیں' اس دور میں اُس کے داعیٔ اوّل کی حیثیت دراصل مولانا آزاد کو حاصل ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کی کشمکش اور اس میں تلخی کی شدّت کے باعث جو نفرت مولانا آزاد سے تھی وہ ختم ہوگئی اور اس کی جگہ ایک حسرت آمیز تأسّف نے لے لی کہ اتنا عظیم کام چھوڑ کر وہ اب کن وادیوں میں سرگرداں ہیں اور دوسرا اور اہم تر نتیجہ یہ

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کے حصول کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ حصار کے صنعتی سکول کے ایک انسٹرکٹر غلام محمد بھٹی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ خود ایک بہت ماہر جلد ساز تھے اور ان کے پاس نہایت اعلیٰ مجلّد کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ میں نے جب مولانا مرحوم کی تصانیف ان سے عاریتہً برائے مطالعہ مانگیں تو وہ بھی خان عزیز الدین حمزئی ہی کی طرح شش و پنج میں مبتلا ہوگئے اور انہوں نے بھی جان چھڑانے کی وہی تدبیر اختیار کی یعنی 'مجموعۂ مضامینِ الہلال' کھول کر ایک فارسی شعر جو سامنے آگیا اس کے معنی مجھ سے پوچھ لئے۔ میں نے فارسی بالکل نہ پڑھی تھی' اس لئے پہلے تو ذرا جھجکا' لیکن جب ذرا غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو اردو ہی کے الفاظ ہیں جو بس ذرا آگے پیچھے کر دیئے گئے ہیں' چنانچہ میں نے معنی بیان کر دیئے اور کتاب حاصل کر لی!

نکلا کہ میرے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ اصل اہمیت اشخاص کی نہیں بلکہ مقاصد کی ہے اور نگاہیں شخصیتوں پر نہیں بلکہ کام پر مرتکز رہنی چاہئیں۔

---

اکتوبر ۴۷ء کے اوائل میں انڈین ملٹری نے حصار میں ہماری قلعہ بندیاں زبردستی توڑ ڈالیں اور پوری مسلمان آبادی کو ایک نوتعمیر شدہ جیل کے احاطوں میں قائم شدہ کیمپ میں محبوس کر دیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد ہم لوگ ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس روز میں ایک سو ستر میل کا فاصلہ طے کر کے، اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو غالباً ۷ نومبر ۴۷ء کو براستہ سلیمانکی ہیڈ ورکس پاکستان میں داخل ہوئے اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا!

پاکستان میں والد صاحب مرحوم و مغفور اوّل تو لاہور ہی میں تعینات ہوئے لیکن جلد ہی ان کا تبادلہ قصور ہوگیا اور میں ایف ایس سی (میڈیکل) کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل اور محلّہ کرشن نگر میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم ہوگیا۔

ایف ایس سی کی تعلیم کے دو سالوں کے دوران میں نے حلقہ ہمدردان جماعت اسلامی سے باقاعدہ منسلک ہو کر بہت مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ کام کیا۔ اس وقت کے خصوصی جوش و خروش میں بہت سے عوامل کو دخل حاصل تھا۔ ایک تو پاکستان کا قیام ہی کچھ کم جذبات انگیز واقعہ نہ تھا پھر جس قسم کے حالات میں سے گزر کر پاکستان پہنچنا نصیب ہوا تھا اس نے فوری طور پر ملّی اور دینی جذبات کو بہت بھڑکا دیا تھا اور کچھ صورت حال بھی بظاہر ایسی نظر آتی تھی کہ جیسے احیائے اسلام کی منزل بہت قریب ہے۔ قیام پاکستان سے گویا اصل مرحلہ تو طے ہو ہی گیا ہے اب کسر صرف اتنی ہے کہ اس میں 'اسلامی نظام' قائم کر دیا جائے۔ پھر اسے بنیاد (Base) بنا کر

---

لہ اس وقت یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ "ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!"

اسلام کے عالمی غلبے کی سعی و جہد بہت آسان ہو جائے گی۔ منزل کے اس قرب کے اس احساس نے آتشِ شوق کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ ان حالات میں جب جماعت اسلامی پاکستان میں "قیام نظامِ اسلامی" کی داعی بن کر سامنے آئی تو گویا اس نے جملہ قومی و ملّی اور دینی و مذہبی جذبات کو اپیل کیا اور دوسرے بے شمار کارکنوں کی طرح میں بھی حد درجہ کیف و سرور کے عالم میں اس کی جدّوجہد میں عملاً شریک ہوگیا۔

اُسی زمانے میں مَیں نے جماعت کے لٹریچر کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف تو اس زمانے میں کچھ ثقیل اور کچھ روکھی اور پھیکی معلوم ہوتی تھیں لیکن مولانا مودودی کی تصانیف کا ایک ایک حرف نظر سے گزار لیا۔ بایں ہمہ میں تحریک اسلامی کے ساتھ اپنے اس دور کے تعلق کو بھی شعوری نہیں، نیم شعوری قرار دیتا ہوں۔

اواخر ۴۹ء میں مَیں میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوا اور ساتھ ہی میری رہائش بھی کالج کے ہاسٹل میں منتقل ہوگئی۔ نتیجتہً تنظیمی اعتبار سے میرا تعلق جماعت اسلامی سے منقطع اور اسلامی جمعیت طلبہ سے قائم ہوگیا۔

۵۰ء میں میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی اور فوراً ہی نظامتِ حلقہ میڈیکل کالج کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا گیا۔ ۵۱ء میں میں جمعیت لاہور کا ناظم بھی بنا دیا گیا اور جمعیت پنجاب کا بھی اور ۵۲ء میں میں جمعیت کا ناظم اعلیٰ منتخب ہوگیا.....

واضح رہے کہ میں ان 'مناصب' کا ذکر کسی احساس فخر کے تحت نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کر رہا ہوں کہ اس دور میں میں نے انتہائی جوش و خروش اور حد درجہ انہماک کے ساتھ اور تحریک کے تقاضوں کو دوسری ہر چیز پر مقدّم جان کر کام کیا۔ یہاں تک کہ اپنی تعلیم کے نقصان[1] اور اپنے پیشہ ورانہ

---

[1] یہ تو مجھ پر اللہ کا فضل رہا کہ میرا پورا تعلیمی کیریر کسی امتحان میں فیل ہونے کے داغ سے بچا رہا تاہم پرائمری، مڈل، میٹرک، ایف ایس سی اور میڈیکل کالج کے فرسٹ ایر کے امتحانات میں جو شاندار کامیابیاں میں نے حاصل کیں وہ بعد میں برقرار نہ رہیں!

مستقبل (Professional Career) کی تباہی کی بھی کوئی پرواہ نہ کی..... گویا

خیریّتِ جاں، راحتِ تن، صحّتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

یہاں کوئی صاحب یہ گمان نہ فرمائیں کہ مجھے اس پر کوئی پشیمانی یا پچھتاوا ہے، حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اپنی زندگی کا وہ دور مجھے انتہائی عزیز ہے اور اس کی یاد کو میں اب بھی اپنی ایک قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج دین کی جس خدمت کی توفیق مجھے بارگاہِ خداوندی سے ملی ہوئی ہے اس کی اساس اور بنیاد اسی دور میں قائم ہوئی تھی۔ گویا میرا معاملہ تو وہ ہے کہ ؎

اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت!

چنانچہ تحریر و تقریر کی جو بھی تھوڑی بہت صلاحیت آج مجھ میں ہے وہ اسی دور میں ابھری اور پروان چڑھی اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بطور زبان مجھے اردو پر نہ اُس وقت کوئی عبور حاصل تھا نہ اب حاصل ہے، تاہم ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اظہارِ مافی الضمیر کی جو بھی تھوڑی بہت استعداد مجھے حاصل ہے اس کی اوّلین تربیت جمعیت طلبہ کے ہفتہ وار آرگن 'عزم' کی ادارت ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اسی طرح کوئی شعلہ بیان خطیب یا جادو اثر مقرر تو میں نہ اُس وقت تھا نہ آج ہوں تاہم تقریر و بیان کی جو بھی تھوڑی بہت صلاحیت مجھ میں موجود ہے وہ تمام تر اسی دور کی مرہونِ منّت ہے۔

جہاں تک مولانا مودودی کی تصانیف کا تعلق ہے ان کا تو میں اس دور میں 'متعلّم' ہی نہیں، 'معلِّم' بن گیا تھا خصوصاً ان کی جو تحریریں تحریک جماعت اسلامی کے اصول و مبادی اور اس کے مختلف ادوار سے متعلق تھیں ان کا تو ایک حد تک 'حافظ' ہوگیا تھا چنانچہ اس تحریک کی امتیازی خصوصیات اور اس کے مخصوص طریقِ

کار کے بارے میں اس دور میں میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا تھا اور اس میں کوئی ابہام نہ رہا تھا۔

مزید برآں اس دور میں مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم یہ ہوا کہ مجھے اولاً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف اور پھر ان کی وساطت سے قرآن حکیم کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہوگئی۔ مولانا کی تصانیف میں سے خصوصاً "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" سے مجھے عشق کی حد تک قلبی تعلق پیدا ہوگیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اسی کتاب کے ذریعے مجھ پر تحریک اسلامی کا 'دینی فکر' واضح ہوا اور فریضۂ تبلیغ و شہادتِ حق کی اصل اہمیت منکشف ہوئی۔ پھر جب مولانا کی ایک دوسری تالیف 'تدبّرِ قرآن' کے نام سے شائع ہوئی تو اس کا مطالعہ بھی میں نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک پختہ ذہنی مناسبت اور محکم قلبی انس کی بنیاد اس کتاب سے قائم ہوئی۔

دسمبر ۵۱ء کی کرسمس اور جولائی ۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے لاہور میں "تربیتی کیمپ" منعقد کئے جن میں قرآن حکیم کے چند منتخب مقامات کا درس مولانا اصلاحی نے دیا۔ میں خود ان دونوں کیمپوں میں بحیثیت ناظم شریک تھا چنانچہ میں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ ان سے نہ صرف یہ کہ میرے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی و قلبی تعلق میں اضافہ ہوا بلکہ میری طبیعت میں تعلیم و تعلّمِ قرآن کا داعیہ شدت کے ساتھ بیدار ہوگیا۔

قرآن حکیم کے ساتھ اس ذہنی و قلبی مناسبت اور اس قوت گویائی اور صلاحیتِ بیان نے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں' مل جل کر مجھے اسی زمانے میں 'مدرّسِ قرآن' بنا دیا' چنانچہ جمعیت کے اجتماعات میں بھی 'درس قرآن' کی ذمہ داری اکثر و بیشتر مجھی پر رہتی تھی اور تعطیلات کے زمانے میں جب میں گھر آتا تھا (اُس وقت تک والد صاحب مرحوم منٹگمری حال ساہیوال میں اقامت اختیار فرما چکے

تھے) تو جماعت اسلامی کے اجتماعات میں بھی درس قرآن کی فرمائش مجھ ہی سے کی جاتی تھی اور میرا درس بالعموم پسند کیا جاتا تھا۔[1]

> قرآن حکیم کے ساتھ اس تعلق کا سب سے بڑا فائدہ جو مجھے پہنچا وہ یہ کہ دین کی اساسی تعلیمات بھی مجھ پر براہ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح ہو گئیں اور خاص طور پر دعوت و تبلیغ دین کی اہمیت اور شہادتِ حق اور اقامتِ دین کی فرضیت بھی مجھ پر ازروئے قرآن منکشف ہو گئی گویا "فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى" کے مصداق میرے دینی فکر کا ایک براہ راست تعلق قرآن حکیم سے قائم ہو گیا۔

اس کی اہمیت کا اندازہ مجھے اس وقت تو نہ تھا لیکن بعد میں اس کا احساس مجھے شدت کے ساتھ ہوا کہ اگر خدانخواستہ اس وقت اس پہلو سے کوئی کمی رہ جاتی تو بعد میں جب بعض شخصیتوں سے میرا عقیدت کا رشتہ کمزور پڑا' یہاں تک کہ بالکل منقطع بھی ہو گیا اور جمعیت اور جماعت دونوں سے تنظیمی رشتہ بھی ختم ہو گیا تو اس

---

[1] ۵۳ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو درس سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا میں نے دیا تھا اس کا ذکر تقریباً بیس سال بعد ۷۲ء میں کراچی کے ایک سفر کے دوران میرے سامنے بہت عجیب طریقے سے آیا۔ ریل میں ایک ہم سفر سے گفتگو ہو رہی تھی جس میں تعلیم و تعلّم قرآن کی اہمیت کا ذکر چل نکلا۔ اس پر ان صاحب نے عجیب کیفیت کے ساتھ کہا کہ "صاحب! ایک درس ۵۳ء میں ہم نے سنا تھا اس کی حلاوت کا احساس ابھی تک باقی ہے!" میں نے ذرا کریدا تو معلوم ہوا کہ دراصل میرے ہی درس کا ذکر ہے۔ چنانچہ میں نے بات وہیں ختم کر دی اور اپنا مزید تعارف مناسب نہ سمجھا! اسی طرح ۵۴ء میں ملتان میں منعقد جمعیّت کی تربیت گاہ میں مولانا اصلاحی سے پڑھے ہوئے مقامات کا جو درس میں نے دیا تھا اس کا ذکر بہت سے احباب آج بھی کرتے ہیں۔ فللّٰہ الحمد والمنّۃ۔

فکر کا پورا تانا بانا بھی درہم برہم ہو جاتا اور میں بھی ان بہت سے لوگوں کے مانند ہو جاتا جو جماعت اسلامی سے علیٰحدہ ہوئے تو ان کا تعلق نہ صرف تحریک اسلامی بلکہ بعض افسوسناک مثالوں کے اعتبار سے تو گویا اسلام ہی سے منقطع ہو گیا۔

الغرض جمعیتِ طلبہ سے تعلق کا زمانہ میری زندگی کا اہم ترین دور ہے جس میں خود دین و مذہب کے ساتھ بھی میرا صحیح فکری تعلق قائم ہوا اور تحریک تجدید و احیائے دین کے ساتھ بھی میرے حقیقی اور شعوری تعلق کا آغاز ہوا[1] اور احیائے اسلام اور تجدید ملت کا وہ جذبہ جو بچپن میں علامہ اقبال مرحوم کی شاعری سے پیدا ہوا تھا اور جس میں ایک دینی فکر کا پیوند ابتداءً مولانا مودودی کی تحریروں سے لگا تھا بالآخر مولانا اصلاحی کی تصانیف کی وساطت سے قرآن حکیم کی محکم اساس پر استوار ہو گیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰانَا اللّٰهُ

---

۱۹۵۴ء میں میں نے ایم بی بی ایس کا آخری امتحان پاس کیا اور جیسے ہی میرا نتیجہ نکلا میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت سے استعفاء دے دیا اور جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست داخل کر دی اس لئے کہ میرے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک تھا کہ "اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" (مشکوۃ شریف، عن حارث الاشعری) اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری زندگی میں چند دن بھی بغیر جماعت کے بسر ہوں۔

لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی میں میرا قیام بہت مختصر رہا۔

---

[1] اس دور میں اللہ کے دین کی بنیادی دعوت اور مسلمانوں کے دینی فرائض اور اہل ایمان سے اللہ کے دین کے تقاضوں اور مطالبوں کا جو تصوّر میرے ذہن میں راسخ ہوا تھا اس کے بارے میں اب کچھ کہنے سننے کے بجائے میں اپنی اسی دور کی بعض تحریروں اور تقریروں سے کچھ اقتباسات اس کتاب میں شامل 'ضمیمہ' میں درج کر رہا ہوں تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ یہ سب بعد کی خیال آرائیاں ہیں!

رکن کی حیثیت سے جماعت میں شامل ہوتے ہی پہلی بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے جماعت پر شدید انحطاط اور اضمحلال طاری ہو چکا ہے اور اس کے متوسلین میں کسی انقلابی تحریک کے بجائے عام سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کا سا مزاج پیدا ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ جماعت کی دعوت اور اس کی اپیل کا رخ بھی اب وہ نہیں رہا جو آغاز میں تھا بلکہ اس میں بھی ایک عام سیاسی جماعت کا سا انداز پیدا ہو چکا ہے۔

میرے ذہن نے جب اس قلبِ ماہیت کے اسباب و عوامل پر غور کرنا شروع کیا تو ساتھ ہی ایک اور سوال جو ابھر کر سامنے آ کھڑا ہوا وہ یہ تھا کہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں نظامِ اسلامی کا قیام جو اس قدر آسان اور بالکل قریب نظر آ رہا تھا وہ آٹھ سالہ جدوجہد کے باوجود روز بروز نگاہوں سے دُور تر کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے؟

جیسے جیسے میں ان مسائل پر غور کرتا گیا مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی گئی کہ تحریک جماعت اسلامی اپنے اصل رخ سے بھٹک گئی ہے اور ۱۹۷۴ء میں ملک کے بدلے ہوئے حالات میں 'مواقع' اور 'امکانات' کے 'دامِ ہمرنگِ زمیں' میں گرفتار ہو کر جماعت اسلامی کی قیادت نے طریق کار میں جو تبدیلی کی تھی اس نے تحریک کی ساری بلند پروازی کو ختم کر کے رکھ دیا ہے اور اب جماعت کا "اصولی' اسلامی' انقلابی" کردار تو ع "خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق داستانِ پارینہ بن چکا ہے البتہ ایک اسلام پسند' قومی' سیاسی پارٹی کی حیثیت سے جماعت کا وجود باقی ہے!

ابتداء میں یہ انکشاف میرے لئے حد درجہ اذیت بخش تھا اور مجھ پر شدید رنج و غم اور مایوسی کا غلبہ ہو گیا تھا مگر جیسے جیسے اس مسئلے کے دوسرے پہلو واضح ہوتے گئے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت کی اس تبدیلی کو محسوس کرنے والا میں تنہا ہی نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن میں ایک اچھی بھلی تعداد اس کے

'اکابر' کی بھی ہے تو ذرا ہمت بندھی کہ غلطی کا ازالہ ممکن ہے اور ذرا کوشش کی جائے تو اس تحریک کو دوبارہ اپنے اصل رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔

اسی امید پر میں نے اڑھائی صد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تحریر کے ذریعے جماعت اسلامی کے قبل از تقسیم ہند موقف اور طریق کار اور بعد از تقسیم پالیسی کے تفاوت اور تضاد کو واضح کیا اور جماعت کے ارباب حل و عقد سے اپیل کی کہ وہ نئے طریق کار کو ترک کر کے سابق طریق کار ہی کی جانب رجوع کریں!

میری یہ تحریر اب "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے اور اس موضوع پر میں اس وقت مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ میں نے یہ تحریر ۱۹۵۶ء میں لکھی تھی اور اب ۷۴ء ہے' لیکن اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی میں اسے اتنا ہی صحیح سمجھتا ہوں جتنا اس وقت سمجھتا تھا اور میرے موقف میں سرِمو فرق واقع نہیں ہوا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی ہی پیدا ہوتی چلی گئی ہے!

لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی میں یہ اختلافِ رائے انتہائی ہنگامہ خیز بن گیا اور اواخرِ ۵۶ء اور اوائل ۵۷ء کا تقریباً چھ ماہ کا عرصہ جماعت اسلامی پاکستان پر ایک سخت بحرانی کیفیت میں گزرا۔ جس کے نتیجے میں کم و بیش ستّر اسّی ارکان جماعت سے علیٰحدہ ہوگئے جن میں مجھ ایسے عام کارکنوں کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالجبار غازی' مولانا عبدالغفار حسن' مولانا عبدالرحیم اشرف' شیخ سلطان احمد' سردار اجمل خاں لغاری ایسے اکابر بھی شامل تھے اور گویا جماعت کی قیادت کی پوری صفِ دوم جماعت سے کٹ گئی تھی۔

یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا اور اس کی اصل ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ ایک بڑی تلخ داستان ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم میں نے آیۂ مبارکہ

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا"[1] کے حوالے سے 'نقضِ غزل' کے عنوان کے تحت اس کے اہم حصے سپردِ قلم کر دیئے تھے' جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں ان کا مطالعہ کر لیں۔[2]

میں نے جماعت کی رکنیت کی درخواست ۱۵ نومبر ۵۴ء کو تحریر کی تھی اور تقریباً ڈھائی سال بعد اپریل ۵۷ء کی کسی تاریخ کو میں نے انتہائی بوجھل دل کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے استعفاء تحریر کر دیا۔[3]

**لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں نے زندگی کا وہ نصب العین بھی ترک کر دیا جس کے حصول کے لئے میں نے جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی اور احیائے اسلام و تجدیدِ دین اور شہادتِ حق و اقامتِ دین کی اس جدّوجہد سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی جسے میں نے پورے شعور و ادراک کے ساتھ اپنا دینی فرض سمجھ کر قبول کیا تھا۔**

اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ بحمد اللہ گزشتہ سترہ اٹھارہ سالوں کے دوران میں مجھ پر کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میری نگاہوں سے احیائے اسلام اور اقامتِ دین کا بلند و بالا نصب العین اوجھل ہوا ہو یا مجھے اپنے ان فرائض کے بارے میں کوئی شک یا شبہ لاحق ہوا ہو۔ سبب اس کا پہلے ہی بیان کر چکا ہوں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا تعلق پہلے ہی اشخاص سے نہیں بلکہ قرآن

---

[1] سورۂ نحل آیت ۹۲: "نہ بن جاؤ اس بڑھیا کے مانند جس نے سوت کاتنے کے بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا!"

[2] یہ داستان حال ہی میں مکمل صورت میں "تاریخ جماعتِ اسلامی کا ایک گمشدہ باب" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے!

[3] درخواستِ رکنیت اور تحریرِ استعفا دونوں "تاریخ جماعتِ اسلامی کا ایک گمشدہ باب" میں شامل ہیں۔

حکیم سے قائم ہو چکا تھا اور یہ بات مجھ پر ازروئے قرآن منکشف ہو چکی تھی کہ شہادتِ حق میری ذمّہ داری اور اقامتِ دین میرا فرض ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہو جس میں انشراحِ صدر کے ساتھ شریک ہو کر اپنے ان فرائض کو ادا کر سکوں تو فبہا' اس جماعت کا وجود میرے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا' اگرچہ کام کٹھن ضرور ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان ازخود کھڑا ہو اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے دوسروں کو دعوت دے اور ایک جماعت تشکیل دے کر ان فرائض سے عہدہ برآ ہو یا بصورت آخر کم از کم اپنی ذاتی حیثیت میں تن تنہا کوشاں رہے۔

اشخاص آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ جماعتیں بنیں گی اور منتشر ہو جائیں گی لیکن اللہ کا دین بھی دائم و قائم رہے گا اور اس کی کتاب بھی! انسان کا فرض یہ ہے کہ فرمانِ نبوی "قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا كِتَابَ اللّٰهِ"[1] کے مصداق قرآن ہی کو اپنا رہنما اور ہادی و امام بنائے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق مرحمت فرما دے تو اسے سراسر اُسی کا فضل و کرم اور انعام و احسان سمجھے گویا:۔

مِنّت مَنِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی!
مِنّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

---

جماعت اسلامی سے علیٰحدگی کے بعد ابتداءً قوی امید تھی کہ علیٰحدہ ہونے والے حضرات ایک نئی تنظیمی ہیئت تشکیل دے کر جماعت کے سابق طریق کار کے طرز پر

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ایک فقرہ: "میں چھوڑ چلا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یعنی کتاب اللہ!"

عملی جدّوجہد شروع کر دیں گے اور یہ امید ہرگز بے بنیاد نہ تھی اس لئے کہ علیٰحدہ ہونے والوں میں نہ اہلِ علم کی کمی تھی نہ اصحابِ فضل کی' اور ان میں چار حضرات وہ بھی تھے جن کے کاندھوں پر مولانا مودودی کی اسیری و نظربندی کے مختلف مواقع پر جماعت کی امارت کا بوجھ آ چکا تھا گویا تنظیمی اعتبار سے بھی جماعت میں ان کا مقام بلند رہا تھا!

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دو سال یعنی وسط ۵۷ء سے وسط ۵۹ء کا عرصہ اس حال میں بیتا کہ آج لاہور کا سفر ہے تو کل لائلپور کا اور ابھی رحیم آباد سے لوٹا ہوں تو سکھر کے لئے رختِ سفر باندھ رہا ہوں۔ وَقِس علیٰ ہٰذا۔ یہاں تک کہ ایک بار یعنی دسمبر ۵۸ء میں تو ساہیوال میں اپنا مطب بند کر کے اہل و عیال سمیت کراچی منتقل ہو گیا۔ اگرچہ وہاں سے چھ یا سات ماہ بعد ہی والد صاحب مرحوم کی علالت کے باعث لوٹ آنا پڑا۔

اس دوران میں متعدّد اہم مشاورتی اجلاس بھی منعقد ہوئے جن میں سب سے بڑا خود میرے زیر اہتمام عزیز ٹینریز ہڑپہ میں منعقد ہوا تھا جس میں تقریباً تمام اہم لوگ شریک ہوئے اور جو غالباً تین روز تک جاری رہا۔

لیکن افسوس کہ یہ ساری بھاگ دوڑ بے نتیجہ رہی اور مختلف اسباب کی بنا پر جماعت سے علیٰحدہ ہونے والے حضرات کسی نئی ہیئتِ اجتماعیہ کے قیام پر متفق نہ ہو سکے اور رفتہ رفتہ سب نے اپنے اپنے ذوق اور مزاجِ طبع کی مناسبت سے انفرادی طور پر مختلف تعمیری سرگرمیوں کا آغاز کر دیا جو تقریباً سب کی سب علمی و تعلیمی نوعیت کی تھیں۔ مثلاً مولانا اصلاحی صاحب نے لاہور میں حلقہ تدبّرِ قرآن قائم کر لیا' ماہنامہ 'میثاق' جاری فرمایا اور تفسیر تدبر قرآن کی تسوید کا آغاز کر دیا۔ حکیم عبدالرحیم اشرف نے لائل پور میں 'جامعہ تعلیمات اسلامیہ' قائم کر لیا اور ہفت روزہ 'المنبر' پر محنت شروع کر دی۔ مولانا عبدالغفار حسن ابتداءً ان کے شریک کار رہے

اور بعد میں میرے ساتھ اشتراکِ عمل کے لئے ساہیوال منتقل ہوگئے۔ مولانا عبدالجبار غازی نے راولپنڈی میں ایک ہائی سکول قائم کیا اور وہ اس کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن منہمک ہوگئے' سردار اجمل خاں لغاری نے ' ادارہ اجمل باغ ' کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی کے طرز پر ایک ادارہ قائم کر لیا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

میں نے بھی وسط ۵۹ء میں کراچی سے واپس ساہیوال آ کر دو کاموں کا آغاز کر دیا۔ یعنی ایک حلقہ مطالعۂ قرآن اور دوسرے کالج میں زیر تعلیم طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے ایک ہاسٹل کا قیام۔ ان دونوں سے مقصود ایک ہی تھا یعنی مقدم الذکر کے ذریعے عوام میں اور مؤخر الذکر کے ذریعے کالج کے طلبہ میں قرآن حکیم سے ایک قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق پیدا کرنے کی کوشش۔ اس غرض کے لئے میں نے ان مقامات پر بعض اضافے کر کے جو میں نے مولانا اصلاحی صاحب سے پڑھے تھے ایک قدرے وسیع تر منتخب نصاب مرتب کیا اور اس کا درس دیا۔

تقریباً ڈھائی برس (یعنی اواخر ۶۱ء تک) میں ساہیوال میں اپنے مطب کے ساتھ ساتھ ان دونوں کاموں میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہا۔

اوائل ۶۲ء میں بڑے بھائی صاحب کی طرف سے دین اور دنیا یعنی معاش اور معاد دونوں کے لئے مشترکہ کوشش کی ایک نہایت دل آویز اور خوش آئند تجویز کے تحت میں کراچی منتقل ہوگیا اور اگرچہ بہت جلد محسوس ہوگیا کہ یہ بھی ایک "دامِ ہمرنگِ زمیں" ہی ہے' تاہم ایک دفعہ اس میں گرفتار ہونے کے بعد کم و بیش تین سال اس سے رہائی حاصل کرنے میں لگے اور ۶۵ء میں مَیں واپس ساہیوال آ سکا۔

کراچی کے اس قیام کے دوران میں بھی میرا جنوں بالکل بیکار نہ بیٹھ سکا۔ چنانچہ وہاں بھی میں نے مقبول عام ہائی سکول میں ایک "حلقۂ مطالعۂ قرآن" قائم کیا جس کے ہفتہ وار اجتماعات میں مَیں اُسی منتخب نصاب کا درس دیتا رہا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے! دوسرے اس زمانے میں مَیں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا

امتحان بھی کر لیا جس میں اتفاقاً میں یونیورسٹی میں اول بھی آگیا!

ساہیوال اور کراچی میں قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس سے کسی اور کو کوئی نفع پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو کم از کم مجھے ضرور یہ فائدہ پہنچا کہ تحریک اسلامی سے مسلسل آٹھ نو سال تک تنظیمی اعتبار سے لاتعلق رہنے کے باوجود اس کی اساسی دعوت سے بھی میرا ذہنی اور قلبی تعلق برقرار رہا اور اپنے دینی فرائض کے احساس اور ذمہ داریوں کے شعور سے بھی میرا ذہن فارغ نہ ہو سکا گویا مجھے اپنا سبق یاد رہا اور میری حالت اس شعر کے مصداق رہی کہ ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

کراچی سے واپس ساہیوال آ کر میں ابھی اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ۱۱ نومبر ۶۵ء کو والد صاحب انتقال فرما گئے' اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ نتیجۃً سرزمین ساہیوال سے جو ایک محکم رشتہ ان کی وجہ سے قائم تھا وہ ختم ہوگیا۔ ادھر دو بار نقل مکانی کے بعد اب از سرنو ساہیوال میں پریکٹس شروع کرنے میں بھی کچھ حجاب سا محسوس ہوتا تھا۔ سلبی طور پر ان دو عوامل اور اثباتی طور پر اس خیال نے کہ ' مقصدِ زندگی ' کے اعتبار سے سرزمینِ لاہور ہی میں کسی کام کا آغاز مناسب ہوگا' مجھے اواخر ۶۵ء میں ساہیوال سے لاہور لا بٹھایا' اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا!

---

لاہور میں میرا اوّلیں پروگرام یہ تھا کہ میں ' حلقۂ تدبّرِ قرآن ' میں شامل ہو کر مولانا اصلاحی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمّذ تہہ کروں گا اور عربی کی تکمیل بھی کروں

گا اور علمِ قرآن کی تحصیل بھی۔ لیکن کچھ عرصہ حلقے میں شرکت کرنے کے بعد میں نے بھی محسوس کیا کہ مولانا پر پہلے گروپ پر محنت کے نتائج کے پیشِ نظر کچھ تکان سی طاری ہو چکی ہے اور اب وہ دوبارہ اس نوعیّت کی محنت پر آمادہ نہیں ہیں اور خود مولانا نے بھی واضح الفاظ میں یہ بات فرما دی۔ نتیجۃً میرا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اب جو آئندہ کے پروگرام کے بارے میں غور کیا تو وہ چنگاری پھر پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی جو گزشتہ آٹھ نو سالوں کے دوران بھی ع "آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ!" کے مصداق سلگتی رہی تھی، چنانچہ نگاہیں دو کاموں پر مرتکز ہو گئیں۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی سے علیٰحدہ ہونے والے سابق رفقاء میں سے زیادہ سے زیادہ جتنے لوگ ذہنی یکسوئی اور فکری یک جہتی کے ساتھ مجتمع ہو سکیں انہیں ایک نظم میں منسلک کیا جائے تاکہ عمومی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا کام منظم طریق پر کیا جا سکے اور فریضۂ شہادتِ حق اور اقامتِ دین کے لئے اجتماعی جدّوجہد دوبارہ انہی خطوط پر شروع کی جا سکے جن پر جماعت اسلامی نے اپنے دورِ اوّل میں کام کا آغاز کیا تھا اور دوسرے یہ کہ علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت کا وسیع بندوبست کیا جائے تاکہ ذہین نوجوان قرآن حکیم کی جانب متوجّہ ہوں اور اس چشمۂ علم و حکمت سے کماحقہٗ سیراب ہو کر اس کی ہدایت و رہنمائی کو خالص علمی انداز میں پیش کر سکیں۔

پہلے مقصد کے لئے میں نے اولاً ۵۶ء کا تحریر شدہ بیان پورے دس سال بعد[1]

---

[1] مولانا محمد منظور نعمانی مدیر 'الفرقان' لکھنؤ نے مولانا اصلاحی صاحب کے نام اپنے ایک خط میں جو 'میثاق' بابت نومبر ۷۶ء میں شائع کر دیا گیا تھا کتاب اور اس کے مؤلف کے بارے میں اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ "کتاب بہت خوب ہے اور آٹھ دس سال تک اس کو روکے رکھنے کا ان کا عمل تو بہت ہی قابل داد اور لائق سبق آموزی ہے"۔

"تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا تاکہ ایک طرف تو وہ لوگ جو جماعت اسلامی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور علیحدہ ہونے والوں سے بھی کسی قدر حسنِ ظن رکھتے ہیں اور لاعلمی کے باعث حیران ہیں کہ جماعت میں ۵۷-۵۶ء میں جو اختلافِ رائے پالیسی اور طریق کار کے بارے میں پیدا ہوا تھا اس کی صحیح نوعیت کیا تھی، ان کے سامنے اختلاف کی صحیح صورت آ سکے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی سے منسلک احباب بھی اپنے موقف پر نظرِ ثانی کر سکیں اور گزشتہ نو دس سالہ جدّوجہد کے نتائج کی روشنی میں غور کر سکیں کہ ۵۷-۵۶ء میں پالیسی کے بارے میں صحیح موقف کس کا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علیحدہ ہونے والے حضرات بھی غور کریں کہ وہ جماعت میں کس مقصد سے شامل ہوئے تھے، کس بنیاد پر علیحدہ ہوئے تھے اور اب کیا کر رہے ہیں؟

پھر جب کتاب شائع ہوگئی تو فطری طور پر اس پر اخبارات اور جرائد میں بھی تبصرے ہوئے اور بہت سے حضرات نے انفرادی خطوط میں بھی اظہارِ خیال فرمایا۔ ان 'تبصروں' اور 'آراء' میں دو باتیں نہایت نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ کتاب کے مؤلّف کے خلوص کے بارے میں بھی بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا اور خود کتاب کے اسلوبِ نگارش کو بھی سراہا گیا اور خود جماعتی حلقوں کی جانب سے یا تو حیرت کے انداز میں یا الزامی جواب کے طور پر یہ بات کہی گئی کہ جب جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کا موقف یہ ہے تو آخر انہوں نے علیحدگی کے بعد انہی خطوط پر کسی مثبت جدّوجہد کا آغاز کیوں نہیں کیا؟

اس دوسرے سوال یا الزام کے جواب میں مَیں نے واضح طور پر تسلیم کیا کہ

---

لہ ظاہر ہے کہ اگر مجھے جماعت پر کیچڑ اچھالنا مطلوب ہوتا تو میں یہ کتاب جماعت سے علیحدہ ہوتے ہی فوراً شائع کر دیتا لیکن اس وقت کتاب تو کیا شائع ہوتی میرے استعفے کی خبر بھی اخبار میں شائع نہ ہوئی۔

اگرچہ اس کے بہت سے اسباب ہیں تاہم ہے یہ بہرحال ایک اجتماعی تقصیر اور مجموعی کوتاہی جس کی تلافی جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات پر فرض ہے۔

بحمداللہ ان تمام امور کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ۶۷-۶۶ء میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کے حلقے میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی جسے کسی مفید اور مثبت رخ پر ڈھالنے کی کوشش میں دو بزرگوں یعنی مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب نے خصوصی حصہ لیا۔ نتیجتہً اواخر ۶۷ء میں ایک خاصا بڑا اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا اور اس میں ایک قرارداد اور اسی کی قدرے مفصّل تشریح پر اتفاق ہوگیا اور خاصی قوی امید قائم ہوگئی کہ اب یہ قافلہ واقعتہً سفر کا آغاز کردے گا۔[1]

لیکن معاملہ وہی ہوا کہ ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" اور بعض 'کرم فرماؤں' کی 'کرم فرمائی' سے یہ کوشش نہ صرف یہ کہ پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی بلکہ اپنے پیچھے مایوسی و بددلی اور تشتّت و انتشار کے گہرے سائے چھوڑ گئی۔ میں یہاں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا اس لئے کہ جس نے جو کچھ کیا اس کی جزا یا سزا وہ اپنے رب کے یہاں پالے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔

بہرحال اس مرحلے پر میں نے خوب سوچ سمجھ کر پوری دلجمعی کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے انفرادی طور پر اور ازخود کرنا ہے۔ نہ بزرگوں کے انتظار میں رہنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں تو میں بھی چلوں نہ سابق رفقاء کی راہ تکنی ہے کہ وہ ساتھ قدم ملائیں تو میں بھی سفر کا آغاز کروں۔ ہر شخص خدا کی عدالت میں انفرادی طور پر پیش ہوگا اور اپنی اپنی جوابدہی کرے گا۔ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۔ لہٰذا کوئی اور آگے بڑھے یا نہ بڑھے اور ساتھ دے یا نہ دے، مجھے اپنی ذمہ داری کی

---

[1] یہ قرارداد مع توضیحات "تعارف تنظیم اسلامی" نامی کتاب میں شامل ہے!

## ادائیگی کی فکر بہرحال کرنی ہے!

اب جو میں نے اپنا جائزہ لیا تو نظر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت بھی عطا فرما دی ہے اور کچھ قوتِ گویائی اور تحریر و تقریر دونوں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر کسی قدر قدرت سے بھی نواز دیا ہے۔ لہٰذا دین کی ایک حقیر سی خدمت جو مجھ سے بن آ سکتی ہے اور احیائے اسلام اور شہادتِ حق کی عظیم جدّوجہد میں ایک حقیر سا حصہ جو میں لے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن حکیم سے روشناس اور متعارف کراؤں۔ کتاب اللہ کی عظمت کو اجاگر کروں اور لوگوں کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے کی ترغیب دلاؤں' یہ خدمت میری نسبت سے چاہے کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنی جگہ نہایت عظیم ہوگی۔ اس لئے کہ علم و حکمت کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہی ہے۔ اس سے دلوں میں ایمان اور یقین کی شمعیں روشن ہوں گی' فکر بدلے گا' سوچ بدلے گی' نقطۂ نظر تبدیل ہوگا اور اقدار (Values) بدل جائیں گی۔ نتیجتہً کردار و عمل میں بھی انقلاب برپا ہوگا اور اگر اللہ نے چاہا تو یہی عمل (Process) کسی ہمہ گیر انقلابی جدوجہد کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

لہٰذا میں نے اللہ کا نام لیا اور جنوری ۶۸ء سے اپنی بہتر اور بیشتر مساعی اور اپنے بہتر اور بیشتر اوقات کو اسی مقصد عظیم کے لئے وقف کر دیا اور آج جبکہ مجھے ان خطوط پر کام کرتے سات سال[1] کا عرصہ ہونے کو آیا ہے میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میرا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا اور واقعتہً "کرنے کا اصل کام" یہی تھا! فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ!!

اپنے پیشِ نظر مقصد کے لئے میں نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ وہ

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر ۷۴ء کی ہے۔

چشمۂ فیض پھر پورے زور شور کے ساتھ جاری ہو جائے جس کے طفیل مجھ میں قرآن حکیم کے مطالعے کا ذوق و شوق اور اس کے علم و حکمت کے نشر و اشاعت کا جذبہ پیدا ہوا تھا یعنی مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے استاذ امام حمید الدین فراہی کا فکرِ قرآنی اور اسلوبِ تدبّرِ قرآن!

اس غرض سے اوّلاً میں نے تفسیر تدبّرِ قرآن کی جلد اوّل کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا' اور یہ سراسر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و احسان ہے کہ میں اس کٹھن وادی سے سرخرو ہو کر نکلا[1]۔ اس کے معًا بعد میں نے مولانا کی وہ دو تصانیف شائع کیں جن سے میں ابتداء ہی سے بہت متأثر تھا۔ یعنی "مبادیٔ تدبّرِ قرآن" اور "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار"۔ ان پر مستزاد تھے دو چھوٹے کتابچے یعنی "قرآن اور پردہ" اور "اقامتِ دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار"۔

ثانیاً مولانا اصلاحی کے ایک ہفتہ وار درسِ قرآن کا اہتمام کرشن نگر میں پہلے اپنے مکان پر اور بعد ازاں ایک مسجد میں کیا۔ اگرچہ وہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اور مولانا کی علالت کے باعث جلد ہی بند ہو گیا۔

---

[1] مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر 'صدق جدید' لکھنؤ نے تدبّرِ قرآن جلد اوّل پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "حسنِ معنوی سے قبل نظر کتاب کے جمال ظاہری پر پڑتی ہے اور جم کر رہ جاتی ہے۔ کوئی تفسیر قرآن اتنی حسین و جمیل چھپی ہوئی دیکھنا یاد نہیں پڑتی۔ کاغذ' کتابت' چھپائی' جلد بندی ہر اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے!" اور خود راقم نے لکھا کہ "کسی کام کی تکمیل کے بعد 'فی کم فرغتَ؟' کے بجائے اصل سوال 'ماصنعتَ؟' کا ہوتا ہے تو اس پر میں اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر بجالاؤں کم ہے کہ کتاب کی اشاعت میں دیر چاہے ہو گئی اس کی کتابت' طباعت' جلد بندی سب کی سب نہایت عمدہ ہوئیں۔ مولانا اصلاحی کے لئے شاید کتاب کی تصنیف بھی اتنی بڑی بات نہ ہو جتنی میرے لئے اس کی طباعت اور اشاعت' میں اسی پر خوش ہوں ع شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!" (میثاق مارچ و اپریل ۱۹۶۸ء)

ماہنامہ 'میثاق' جو مولانا نے جون ۵۹ء میں جاری فرمایا تھا اور جس کی اشاعت کچھ عرصے سے بند تھی اس کا دوبارہ اجرا میرے اہتمام میں اور میرے ہی زیر ادارت جولائی ۶۶ء میں ہو چکا تھا[1] جس کے ذریعے اس فکر کی اشاعت بھی ایک وسیع حلقے میں ہو رہی تھی اور مولانا اصلاحی کی تفسیر اور مولانا فراہی کے 'افادات' کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری تھا!

طباعت اور اشاعت کے اس سلسلے کے لئے میں نے 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جسے کوئی اور صورت موجود نہ ہونے کے باعث مجبوراً ذاتی ملکیت کی شکل دی اور واضح کر دیا کہ جیسے ہی کوئی اجتماعی ہیئت قائم ہوئی' یہ پورا سلسلہ اس کو منتقل کر دیا جائے گا۔

دوسری طرف میں نے خود اپنے درس قرآن اور اپنی بعض تحریروں اور تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ بھی پورے اہتمام کے ساتھ شروع کر دیا۔

جہاں تک درس قرآن کا تعلق ہے اس کا آغاز اگرچہ میں نے ۶۷ء کے دوران ہی میں کر دیا تھا' چنانچہ کرشن نگر میں بھی درس کے دو حلقے قائم تھے اور ایک حلقہ کچھ عرصہ دل محمد روڈ پر واقع ایک رفیق کے مکان پر بھی قائم رہا تھا تاہم لاہور میں میرے درس قرآن کا اصل آغاز جنوری ۶۸ء میں سمن آباد میں ہوا۔

---

[1] ایک ماہانہ پرچے کی ضرورت میں نے 'تحریک جماعت اسلامی' کی اشاعت کے فوراً بعد ہی محسوس کر لی تھی چنانچہ کچھ بھاگ دوڑ کر کے "الرسالہ" کے نام سے میں نے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا تھا لیکن جب یہ چیز مولانا کے علم میں آئی تو انہوں نے تاکیداً فرمایا کہ 'الرسالہ' کے بجائے 'میثاق' ہی کو دوبارہ زندہ کر لو۔ چنانچہ میں نے ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور 'میثاق' ہی کا اجرا کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان ہی دنوں مولانا وحید الدین خاں دہلی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ انہیں 'الرسالہ' کا نام اس درجہ پسند آیا کہ اُسی کو اپنے جریدے کے لئے اختیار کر لیا!

تقریب اس کی یہ ہوئی کہ میرے ایک عزیز نے اپنے مکان واقع سمن آباد میں کچھ ترمیم اور کچھ تعمیرِ مزید کے سلسلے میں دو کمروں کے درمیان میں سے ایک دیوار نکلوا دی جس سے ایک بڑا سا کمرہ وجود میں آگیا جس میں کم و بیش ایک صد آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ادھر میں اس فکر میں تو تھا ہی' میں نے فوراً تجویز پیش کر دی کہ یہاں درس قرآن ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے انہیں اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا پس ہر اتوار کی صبح کو درس کی ہفتہ وار نشست شروع ہو گئی۔

ابتداء میں حاضری ۳۵-۳۰ تھی' کچھ ہی عرصے بعد کمرہ بھر گیا۔ صاحبِ خانہ نے ہمت کی اور ایک لاؤڈ سپیکر خرید لیا اور کمرے کے باہر برآمدے اور پھر اس کے بعد لان میں بھی نشست کا انتظام کر دیا۔ لیکن جلد ہی محسوس ہوا کہ ع "کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے!"

مسجدِ خضراء سمن آباد سے اوّل روز ہی سے پرزور فرمائش تھی کہ درس یہاں ہونا چاہئے! میں مساجد کے معاملے میں بہت خائف تھا۔ اس لئے کہ اول تو مسجدیں اکثر و بیشتر فرقوں اور گروہوں کی ہوتی ہیں اور وہاں ایک مخصوص مسلک سے ہٹ کر کچھ کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر ان میں چودھراہٹ کے لئے رسّہ کشی بھی ہوتی رہتی ہے' تاہم جب ضرورت متقاضی ہوئی تو میں نے دعوت قبول کر لی اور درس گھر سے مسجد میں منتقل ہو گیا۔ وہاں اجتماعِ جمعہ میں تقریر کا سلسلہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اس طرح مسجد خضراء اس قرآنی تحریک کا مرکز بن گئی۔

**بعد میں مسجد خضراء میں ایک طویل عرصے تک جو غیر معمولی اور مثالی حالات رہے ان کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کام کو شرف قبول حاصل ہو چکا تھا اور اس کی خصوصی تائید و توفیق اسے حاصل تھی۔**

اسی تائید ایزدی کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی لاہور میں اس حلقۂ درس کی دھوم ہو گئی

اور اتوار کی صبح کو جبکہ عموماً طبائع پر کسل کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور اکثر لوگوں نے بہت سے کام بھی ہفتہ وار چھٹی کے خیال سے رکھے ہوئے ہوتے ہیں بغیر کسی جماعتی تعلّق یا تنظیمی بندھن کے' اور بغیر کسی ہنگامی یا سیاسی مسائل کی چاشنی کے' خالصتہً قرآن مجید کا درس سننے کے لئے آنے والے لوگوں کی تعداد تین ساڑھے تین صد تک پہنچ گئی۔ جن میں اکثریت پڑھے لکھے ہی نہیں' اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ہوتی تھی۔

**در آنحالیکہ درس دینے والا نہ عالم تھا نہ فاضل' نہ اس کے پاس کسی دارالعلوم کی سند تھی نہ کسی خانقاہ کا اجازت نامہ! بلکہ خود اپنے قول کے مطابق اس کی حیثیت محض ایک طالب علم کی تھی۔**

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اس حلقۂ درس کا چرچا صرف لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ کچھ تو لاہور آنے جانے والے لوگوں کے طفیل اور زیادہ تر ان حضرات کے ذریعے جو پہلے لاہور میں تھے اور درس میں شریک ہوتے تھے' بعد ازاں تبدیل ہو کر یا نقل مکانی کر کے دوسرے مقامات پر چلے گئے' اس کا ذکر دور دراز تک پہنچ گیا اور میں اس حقیقت کو چھپانے کا ہرگز خواہشمند نہیں بلکہ "وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ!" کے مصداق اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ اس حلقۂ درس کے چرچے حرمین شریفین میں بھی ہوئے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی۔ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۔

اس حلقے میں سب سے پہلے تقریباً چھ ماہ میں نے مطالعۂ قرآن حکیم کے اسی منتخب نصاب کا درس دیا جو اب ارتقائی مراحل طے کر کے گویا تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ بعد

ازاں قرآن حکیم کا آغاز سے سلسلہ وار درس شروع کر دیا۔ ابتدا میں مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس مرحلے پر لوگوں کی دلچسپی برقرار نہ رہے لیکن صورت اس کے بالکل برعکس ہوئی اور بحمداللہ شوق بڑھتا ہی گیا۔ ۷۰ء کے اواخر اور ۷۱ء کے آغاز میں علالت اور سفرِ حج وغیرہ کے باعث چار ماہ کے تعطّل کے بعد جب اس حلقے میں دوبارہ درس کا آغاز ہوا تو ایک بار پھر میں نے منتخب نصاب ہی کا درس دیا۔ اور اس کے بعد سلسلہ وار مطالعہ شروع کر دیا اور اب تقریباً ساڑھے چھ سال بعد ہم اس حلقے میں قرآن مجید کے چودھویں پارے کا مطالعہ کر رہے ہیں! (یہ ذکر ۷۴ء کا ہے!)

اس حلقے کا نقطۂ عروج تھا اگست ۷۲ء میں منعقد شدہ ایک دس روزہ تربیتی کیمپ جس میں پھر روزانہ تین اسباق کی شرح سے پورے منتخب نصاب کا درس دیا گیا اور جس کے دوران میں مسجد خضراء کا منظر واقعی ایسا تھا جیسے قرآن حکیم کا ایک حقیقی جشن منایا جا رہا ہو۔

اس کے علاوہ لاہور میں متعدّد مقامات پر درس کے حلقے قائم ہوئے جس میں کہیں ہفتہ وار اور کہیں ماہوار درس ہوتے رہے اور اس طرح لاہور کی آبادی کے ایک خاصے قابلِ لحاظ حصّے تک قرآن کی دعوت پہنچا دی گئی!

لاہور میں میرے اس کام کا ذکر سن کر کراچی سے بھی چند اصحاب جن کی اکثریت سے تعارف جماعت اسلامی کے سابق تعلق ہی کی بنا پر تھا غالباً اگست ۷۱ء میں لاہور آئے اور اس طرح کراچی میں بھی اس دعوتِ قرآنی کا آغاز ہوا اور خود میری آمد و رفت کا بھی ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا! جس کے دوران گاہے گاہے ملتان، رحیم یار خاں، صادق آباد اور سکھر میں بھی قیام ہو جاتا تھا اور درسِ قرآن کی نشستیں منعقد ہو جاتی تھیں۔

درس قرآن کے اس روز افزوں سلسلے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی بعض تحریریں بھی کتابچوں کی صورت میں شائع کرنی شروع کیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی

تھی "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام" جس کا علمی حلقوں میں بہت خیر مقدم ہوا۔ چنانچہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ایک مفصّل تحریر اس کی تحسین اور تائید میں لکھی[1] اور جناب صفدر میر نے ایک پورا مقالہ پاکستان ٹائمز کے ادارتی صفحات میں شائع کیا۔ بحمد اللہ اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا غالباً جلد ہی شائع کرنا ہوگا۔ یہ اس لئے کہ اس کی حیثیت گویا اس قرآنی تحریک کے اساسی مینی فسٹو کی بن گئی تھی اور ہے! (اب تک چوتھا ایڈیشن بھی چھپ کر ختم ہو چکا ہے!)

دوسرے نمبر پر میری ایک تقریر شائع ہوئی "قرآن اور امن عالم"۔

اور پھر شائع ہوا وہ کتابچہ جسے اللہ نے وہ قبولِ عام عطا فرمایا کہ باید و شاید! یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" جس کا پہلا ایڈیشن دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا، چنانچہ دوسری بار اسے دس ہزار کی تعداد میں شائع کرنا پڑا اور وہ بھی اب قریباً قریباً ختم ہے[2] جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم و مغفور نے ایسی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی اور جس کا عربی ترجمہ پہلے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامے 'البعث الاسلامی' میں قسط وار شائع ہوا اور بعد میں کتابچے کی صورت میں، اور جسے عوام نے بھی پسند کیا اور خواص نے

---

[1] میرے اس اصل مضمون اور چشتی صاحب کی تائیدی تحریر کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی نے 'صدق جدید' بابت ۷ فروری ۶۹ء میں تحریر فرمایا:

"دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں، دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دونوں فکر انگیز ہیں اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش اور باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے....."

[2] اس کے بعد اس کے متعدد مزید ایڈیشن طبع ہو کر ختم ہو چکے ہیں اور اب حال ہی میں اس کا دسواں ایڈیشن طبع ہوا ہے۔

بھی، جس کی حضرات علماء نے بھی تحسین و تصویب فرمائی اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات نے بھی قدر کی اور داد دی۔ جس کے بارے میں پروفیسر چشتی صاحب نے فرمایا کہ "بلاشبہ یہ مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے سعادتِ اخروی کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے!" اور مولانا اصلاحی صاحب نے دعا دی کہ "اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں!" فللّٰہ الحمد والمنّۃ!

قصّہ مختصر یہ کہ ان حلقہ ہائے درسِ قرآن اور اس سلسلۂ مطبوعات نے مل جل کر اس 'دعوتِ قرآنی' کو ایک تحریک کی صورت دے دی جس نے ۷۲ء میں پہلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھ دیا۔

دین کی اس چھوٹی سی خدمت کا آغاز، جس نے بعد میں 'دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تحریک تعلیم و تعلّم قرآن' کی شکل اختیار کر لی، میں نے اوائل ۶۸ء میں بالکل تن تنہا کیا تھا اور اس میں مجھے سوائے مولانا امین احسن اصلاحی کی دعا اور اشیرواد کے کسی پرانے بزرگ یا رفیق کا تعاون حاصل نہیں تھا بلکہ ان میں سے کچھ حضرات کی جانب سے تو مجھے باقاعدہ مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا جو بعض کی طرف سے تو علانیہ اور کھلم کھلا تھی اور بعض کی طرف سے خفیہ اور درپردہ ..... اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ میں ان سے دل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔

تاہم یہ واقعہ ہے کہ ابتدا میں مجھے محنت بہت شدید کرنی پڑی۔ چنانچہ ایک طرف مطب اور اس کی ذمہ داریاں، دوسری طرف درس ہائے قرآن اور خطاباتِ عام، تیسری طرف ماہنامہ 'میثاق' کی ادارت اور اس کا اہتمام و انتظام[1] اور چوتھی

---

[1] اب غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۷۹ء کے دوران 'میثاق' ہر ماہ ۸۰ صفحات پر مشتمل شائع ہوتا رہا تھا اور اس کی کل ذمّہ داری مجھ پر تھی!

طرف دارالاشاعت اور اس کی گوناگوں مصروفیات' الغرض بالکل مختلف بلکہ متضاد النوع مصروفیات کی کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ہی سال کی مدّت میں صحت نے جواب دے دیا اور مستقل حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

ابتدا میں مَیں نے اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کی' پھر مجبوراً تشخیص کی طرف توجہ کرنی پڑی لیکن بہت سی تحقیق و تفتیش سے جب کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو طے پایا کہ آرام کیا جائے۔ چنانچہ دو تین ہفتوں کے لئے لاہور سے باہر جا کر آرام کیا۔ لیکن واپس آ کر دوبارہ کام شروع کیا تو پھر وہی صورت پیدا ہو گئی' بالآخر کچھ اسی بددلی کے باعث اور کچھ بعض دوسرے اسباب کی بنا پر میں نے طے کیا کہ چار چھ ماہ ملک سے باہر بسر کئے جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ بیرونِ ملک ارضِ مقدّس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی چنانچہ اواخرِ اکتوبر ۷۰ء میں مَیں عازمِ حجاز ہو گیا۔

رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ میں نے پورا مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی معیّت میں بسر کیا۔ اس کے بعد میں ایک ماہ کے لئے برادرِ عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلّمہ کی دعوت پر لندن چلا گیا۔ وہاں سے واپس پھر حجاز آیا اور فروری ۷۱ء میں جامی کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

مشرف گرچہ شد جامی ز لطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کُن!

حجِ بیت اللہ سے دوسری بار مشرف ہوا۔

اس پورے عرصے کے دوران میں میں مسلسل آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچتا رہا اور بالآخر سرزمین حجاز میں حج ہی کے مبارک موقع پر میں نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کر لیا..... یعنی یہ کہ آئندہ مطب کا سلسلہ بالکل بند اور جتنی بھی مہلتِ

## عمر بقایا ہے سب کی سب وقف برائے خدمتِ کتاب اللہ و سعی اعلاء کلمۃ اللہ!

نتیجتاً مارچ ۷۱ء میں ارضِ مقدّس سے واپسی پر جب بالکل یکسو ہو کر از سرِ نو کام کا آغاز کیا تو چند ہی ماہ میں اس نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ ایک تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اس ضرورت کے احساس کو کچھ تقویت اس سے بھی حاصل ہوئی کہ اس وقت تک طباعت و اشاعت کا سارا کام میرے ایک ذاتی ملکیتی ادارے کے تحت ہو رہا تھا اور اگرچہ اس میں یافت کچھ بھی نہ تھی تاہم لوگوں کو ان مطبوعات کی اشاعت کی ترغیب دلانے میں مجھے خود بھی حجاب محسوس ہوتا تھا' اور بعض بزرگوں نے بھی توجہ دلائی کہ یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی!

چنانچہ خیال آیا کہ کوئی ادارہ قائم کیا جائے اور طباعت و اشاعت کا سارا سلسلہ اس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت سے بھی اگر کچھ بچت ہو تو وہ کسی فرد کی کمائی نہ بنے بلکہ ادارے کی ملکیت ہو۔ رہی میری تحریریں تو ان پر تو نہ کوئی منفعت ادارہ حاصل کرے نہ میں ہی کوئی حقِ تالیف وصول کروں تاکہ میں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکوں کہ میرا کوئی مفاد ان کے ساتھ وابستہ نہیں ہے اس لئے کہ اس پورے کام کو محض رسماً تو کرنا مقصود نہیں تھا اصل پیشِ نظر تو یہ تھا کہ یہ ایک صحیح اسلامی دعوت کی تمہید بنے اور دعوتِ حق کے مزاج سے اس چیز کو کوئی ادنیٰ مناسبت بھی حاصل نہیں کہ داعی اپنی دعوتی تحریروں کی رائلٹی کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے۔ 'داعی الی اللہ' کا مقام اور مرتبہ تو بہت ہی بلند ہے اور اس کے لئے تو لازم ہے کہ واضح طور پر یہ کہہ سکے کہ "وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" دین کی کسی ادنیٰ خدمت میں بھی کوئی شخص کسی ادارے یا جماعت سے ایک معیّن مشاہرہ بقدرِ کفاف لے لے تو اس کی گنجائش

تو نکل سکتی ہے لیکن کسی دینی خدمت کے ضمن میں تحریر یا تقریر کو ذریعہ معاش بنانا تو کسی درجے میں بھی مناسب نہیں! چنانچہ ماضی قریب تک ہمارے بزرگوں کا دستور یہ رہا ہے کہ ساری عمر مختلف اداروں یا دارالعلوموں میں نہایت قلیل مگر معیّن مشاہروں پر گزارہ کرتے ہوئے بسر کر دی اور اس پورے عرصے کے دوران میں جو کچھ لکھا اسے ہوا اور پانی کی طرح مباح کر دیا کہ جو شخص چاہے شائع کرے' اپنا کوئی حق تصنیف اس پر نہیں رکھا..... میں اگرچہ ذاتی طور پر تو پہلے ہی سے اس طریق پر عمل پیرا ہو چکا تھا چنانچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا پہلا ایڈیشن اگرچہ شائع تو 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے تحت ہوا تھا لیکن اس پر لکھ دیا گیا تھا کہ "اس کتابچے کی طباعت و اشاعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے[1]!" تاہم اب ضرورت محسوس ہوئی کہ پورے سلسلۂ اشاعت کو ایک نظام کے تحت لے آیا جائے۔

بہرحال' ان گوناگوں اسباب سے ایک ہیئتِ تنظیمی کی ضرورت محسوس ہوئی اور چونکہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ "سمع و طاعۃ" کے ٹھیٹھ اسلامی اصول پر مبنی نظمِ جماعت کا قیام ابھی بہت قبل از وقت تھا لہٰذا ذہن ایک انجمن کی تشکیل کی جانب منتقل ہوا کہ "SERVANTS OF BIBLE SOCIETY" کے طرز پر "انجمن خدّام القرآن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

اب جو غور کیا تو محسوس ہوا کہ تنظیمی اعتبار سے 'انجمن' "اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ"[2] کا کامل مصداق ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے قواعد و ضوابط کا جو

---

[1] اس کتابچے کا انگریزی ترجمہ بھی پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم و مغفور نے بالکل بلا معاوضہ کیا اور جب وہ طبع ہوا تو اس پر بھی تصریح کر دی گئی کہ اس پر کسی فرد یا ادارے کا کوئی حق 'محفوظ' نہیں ہے۔ جو چاہے شائع کرے۔ بعد ازاں اس کا فارسی ترجمہ بھی پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد مرحوم نے از خود اور بالکل بلا معاوضہ کیا!

[2] سورۂ عنکبوت آیت ۴۱ "یقیناً تمام گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے"

ڈھانچہ بنایا جاتا ہے اس کی بنا پر وہ موم کی ناک بن کر رہ جاتی ہے کہ جدھر چاہے موڑ لی جائے بلکہ بسا اوقات انجمن اپنے مؤسسین کے مقصد و منشا کے بالکل خلاف رخ پر چل پڑتی ہے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہ مؤسس یا مؤسسین جنہوں نے کسی انجمن کی تاسیس اور داغ بیل ڈالنے میں خون پسینہ ایک کیا ہوتا ہے اس طرح نکال دیئے جاتے ہیں جیسے دودھ سے مکھی۔

دوسری طرف ایک عرصہ تک غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور مجھ پر یہ بات شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی تھی کہ اسلام کا تنظیمی مزاج نہ صرف یہ کہ دور جدید کی جماعت سازی کے طریقوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ عہد حاضر میں کسی بھی ہیئتِ تنظیمی کی اصل اساس اس کے 'دستور اور قواعد و ضوابط' ہوتے ہیں جن سے عہد وفاداری استوار کر کے لوگ اس ہیئت تنظیمی میں شریک ہوتے ہیں، پھر یہ لوگ اپنے میں سے کثرتِ رائے سے اپنا ایک صدر چنتے ہیں جسے صرف ایک آئینی سربراہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جس کا انتخاب محض ایک معینہ مدت کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اس صدر اور عام اراکین کے مابین ایک اور ادارہ مجلس عاملہ وغیرہ ناموں سے قائم کیا جاتا ہے جس کی اصل غرض اس صدر کی 'نگرانی' ہوتی ہے۔ آگے اس صدر اور مجلس عاملہ یا منتظمہ کے مابین حقوق و اختیارات کی تقسیم کے مختلف طریقوں کی بنیاد پر صدارتی یا پارلیمانی طرز ہائے جماعت وجود میں آتے ہیں لیکن ان سب میں یہ امر بطور قدر مشترک موجود ہوتا ہے کہ تنظیمی ڈھانچہ نیچے سے اوپر کی جانب بڑھتا ہے۔ یعنی اس میں اصل حیثیت بنیادی رکنیت (PRIMARY MEMBERSHIP) کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ صدر یا سربراہ کو!

اس کے برعکس اسلام کا تنظیمی ڈھانچہ اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتا ہے یعنی کوئی شخص معیّن جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتا ہے دین کی کسی خدمت کے داعیے

سے سرشار ہو کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو پکارتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" کون ہے جو اللہ کے دین کی اس خدمت میں میرا دست و بازو بننے کے لئے تیار ہو؟ اور جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ شخصِ معیّن آپ سے آپ ان کا سربراہ بن جاتا ہے اور اسے کسی کے ووٹوں سے 'منتخب' ہونے کی ہرگز کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ وہ محض ایک دستوری اور آئینی سربراہ نہیں ہوتا بلکہ 'امیر' یعنی 'صاحبِ امر' ہوتا ہے اور رہنمائی کی اصل ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے رفقاء سے مشورہ ضرور کرتا ہے لیکن اپنی ضرورت کے احساس کے تحت نہ کہ ان کا حق ادا کرنے کی خاطر..... یہ ایک ایسا فطری نظمِ جماعت ہے جس میں قواعد و ضوابط اور دخول و خروج کے لمبے چوڑے قوانین وضع کرنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ جس شخص کو جس قدر اتفاق اس دعوت کے ساتھ اور جتنا اعتماد اس داعی کی ذات پر ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے اور جب اور جتنی کمی ان دونوں چیزوں میں واقع ہو جائے اسی مناسبت سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ جنہیں اس کے ساتھ کامل اتفاق اور اس پر پورا اعتماد ہو جاتا ہے وہ اس کے ہاتھ پر "بیعت" کر کے اس کے ساتھ سمع و طاعت کے ایک شخصی رابطے میں منسلک ہو جاتے ہیں اور اسی کو اس ہیئتِ تنظیمی کے اصل مرکز (NUCLEUS) کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے!

بنابریں میں نے یہ طے کیا کہ اگرچہ ابھی سمع و طاعت کے اصول پر مبنی ایک ٹھیٹھ اسلامی نظمِ جماعت کے قیام کا وقت تو نہیں آیا اور سردست صرف ایک انجمن ہی قائم کی جائے جس کے تحت اس 'دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن' کے کم از کم ان جملہ امور کو منضبط کر لیا جائے جن کا تعلق روپے پیسے سے ہو' تاہم اس کا تنظیمی ڈھانچہ عام انجمنوں کی طرز پر نہ ہو جس کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے ظریفانہ کلام میں بہت خوب کہا ہے کہ:

الیکشن، ممبری، کرسی، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

بلکہ اسی فطری طرز پر ہو جس کی وضاحت میں کر چکا ہوں اور چونکہ مجھے اس پر پورا انشراحِ صدر حاصل تھا لہٰذا میں نے اسے ہرگز مخفی نہیں رکھا بلکہ اواخر ۷۱ء ہی میں جبکہ ایک انجمن کے قیام کی تجویز ابتدائی مراحل میں تھی، میں نے متعدد بار مسجد خضراء میں درس قرآن کے بعد اپنا ذہن کھول کر حاضرین کے سامنے رکھ دیا اور پھر جولائی ۷۲ء کے 'میثاق' میں 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے مجوزہ خاکے کے ساتھ بھی میں نے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں اپنا نقطۂ نظر پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا۔

اس کا ردِّعمل بھی وہی ہوا جس کی اس 'جمہوریت نواز' بلکہ 'جمہوریت پرست' دور میں مجھے پہلے سے توقع تھی، چنانچہ مذاق بھی اڑایا گیا اور پھبتیاں بھی کسی گئیں۔ لیکن الحمدللہ والمنۃ کہ لاہور میں جن لوگوں نے اس کام میں میرے ساتھ تعاون کا بیڑا اٹھایا تھا ان میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا اور بالآخر اواخر ۷۲ء میں 'مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور' انہی اصولوں پر بالفعل قائم ہو گئی اور اس طرح یہ چھوٹی سی اسلامی تحریک اپنے پہلے تنظیمی مرحلے میں داخل ہو گئی۔

اس مرحلے پر عام لوگوں کے استہزاء کی تو میں نے کوئی پرواہ نہ کی لیکن بعض بزرگوں کا شدید اختلاف میرے لئے بڑی آزمائش بن گیا۔ ان حضرات کی خدمت میں میں نے بصد ادب عرض کیا کہ دلائل سے میری رائے تبدیل ہو جائے تو میں یقیناً رجوع کر لوں گا لیکن محض لحاظِ بزرگی کے باعث یا صرف پاسِ ادب کے طور پر میں اپنا قدم واپس نہیں لے سکتا۔ اس سے کچھ شکر رنجیاں بھی ہوئیں اور بعض معاملات میں

## RE-ADJUSTMENTS بھی کرنی پڑیں لیکن بحمد اللہ کام رکا نہیں بلکہ قافلہ رواں ہی رہا!

اس کے بعد مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی دو ڈھائی سال کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا تھا جسے یہاں حذف کیا جا رہا ہے' اس لئے کہ اب بحمد اللہ

**"دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر"**

نامی کتاب شائع ہو چکی ہے جس میں یہ جملہ تفاصیل موجود ہیں۔

قصّہ مختصر یہ کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس عرصے میں پوری طرح مصروف رہا ہوں اور جہاں تک میرے اوقات اور میری حقیر سی قوتوں اور صلاحیتوں کا تعلق ہے ان کا پورا مصرف انجمن خدّام القرآن کے تحت ہو رہا ہے اور بحمد اللہ اپنی حقیر سی محنت کے نتائج سے بھی میں نہ بددل ہوں نہ مایوس' تاہم اس پورے عرصے کے دوران میں ایک خلش میرے دل میں مسلسل موجود رہی ہے اور یہ سوال بار بار ذہن میں ابھرتا رہا کہ کیا اس طرح میری تمام دینی ذمّہ داریاں پوری ہو رہی ہیں اور میں اپنے جملہ فرائضِ دینی سے عہدہ برآ ہو رہا ہوں؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اپنے اصل فرائض سے پہلوتہی کرنے کی غرض سے گریز کی راہ اختیار کر لی ہو۔ اور ایک باقاعدہ جماعت کے قیام اور شہادتِ حق اور اقامتِ دین ایسے کٹھن فرائضِ دینی کی "تپتی راہوں" سے فرار کی خاطر ایک انجمن اور اس کے تحت صرف درس و تدریس اور طباعت و اشاعت کی "ٹھنڈی چھاؤں" میں بسیرا کر لیا ہو؟[1]

میں نے اپنی سوچ کا جو پس منظر اور اپنے فکر کا جو 'شجرہ نسب' آج تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے پیش نظر اس بات کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں

---

[1] تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری (جگر مرادآبادی)

اس محدود اور جزوی کام پر پوری طرح مطمئن ہو سکتا۔ چنانچہ انجمن خدّام القرآن کے مجوّزہ خاکے کی اس اشاعت کے ساتھ ہی جولائی ۷۲ء کے 'میثاق' میں جو تصریحات میں نے شائع کی تھیں ان میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں کہ:

"واضح رہے کہ راقم الحروف اپنی ذہنی ساخت اور مزاج و طبع کی افتاد کے اعتبار سے محض انجمن سازی پر نہ کبھی پہلے مطمئن ہو سکا ہے اور نہ اب مطمئن ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے پیش نظر بحمد اللہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دینِ حق کا بلند و بالا نصب العین ہے اور اس کے لئے ایک ہمہ گیر جدّوجہد ہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے..... پھر یہ بات بھی اس پر بخوبی واضح ہے کہ یہ کام انجمنوں کے ذریعے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کیلئے لازم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قولِ مبارک کے مطابق سمع و طاعت اور جہاد و ہجرت کی بنیادوں پر باقاعدہ ایک جماعت قائم کی جائے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مناسب وقت کب آئے گا اور فی الوقت ان مقاصدِ عظیمہ کی اصل جدّوجہد کی تمہید کے طور پر صرف تعلیم و تعلّمِ قرآن کے جزوی کام پر اکتفا کئے ہوئے ہے اور پیش نظر انجمن کی حیثیت اس جزوی کام کے بھی ایک شعبے کی ہے۔ چنانچہ مجوزہ انجمن کی قراردادِ تاسیس کے الفاظ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ "منبعِ ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت" بجائے خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود یعنی "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی" کی شرط لازم یعنی "تجدیدِ ایمان کی عمومی تحریک" برپا کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے"۔ (ماہنامہ 'میثاق' بابت جولائی ۷۲ء)

بایں ہمہ مجھے اپنی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا شدید احساس اس راہ میں پیش قدمی سے روکے رہا۔ اس لئے کہ جیسا کہ میں پہلے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں میرے نزدیک مدرّس اور معلّم کا مقام اور ہے، داعی کا مقام اور![1] مدرّس یا معلّم کا کام

---

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر

بات سمجھا کریا راستہ دکھا کر ختم ہو جاتا ہے جبکہ داعی کا فرض یہ ہوتا ہے کہ خود آگے بڑھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے بلکہ خود راہِ عزیمت پر گامزن ہو کر دوسروں کے لئے مثال اور نمونہ پیش کرے اور ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری نہایت کٹھن ہے اور اس کی شرائط بہت سخت ہیں! میں نے جب بھی کبھی اپنے آپ کو ان تقاضوں کے اعتبار سے تولا تو محسوس ہوا کہ میں اس مقام کے کم از کم معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس راہ میں اقدام سے روکے رکھنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

---

لیکن اِدھر کچھ عرصے سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جنہوں نے مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ خدشہ تو' جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' مجھے پہلے بھی تھا کہ کہیں میرا نفس عافیت کوشی کی خاطر مجھے گریز اور فرار کی راہیں نہ سجھا رہا ہو۔ لیکن ایک بزرگ[1] نے یہ اندیشہ بھی پوری شدت کے ساتھ پیش کیا کہ یہ کہیں شیطان کا وسوسہ ہی نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے اقرار اور اعترافِ تقصیر کے پردے میں دراصل وہی دشمنِ ازلی راستہ روکے کھڑا ہو اور معاملہ وہی ہو کہ ۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

پھر یہ بات بھی سامنے آئی کہ معصومیت خاصۂ نبوّت ہے اور نبوّت کا دروازہ بند ہو چکا! امامتِ معصومہ کے قائلین کے لئے تو گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ حالتِ انتظار

---

(بقاحاشیہ صفحہ گذشتہ)

بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں

[1] حاجی عبدالواحد مرحوم

ہی میں رہیں لیکن دوسروں کے لئے تو ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ وہ جیسے بھی ہوں اپنی اصلاح اور تربیت کی فکر کرتے ہوئے فرائض کی انجام دہی پر کمربستہ ہو جائیں۔ پھر یہ بات بھی چاہے کلیتہً صحیح نہ ہو' جزوی حقیقت ضرور ہے کہ کام خود بہترین مربّی ہے اور اصلاح و تربیت کے بعض تقاضے اس کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے کہ انسان اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کردے اور منجدھار میں کود پڑے!

پھر یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اگرچہ راہ نہایت پرخطر ہے اور جو غلطیاں دوسروں سے ہوئیں کوئی ضمانت نہیں کہ ویسی ہی نہیں ان سے بھی کہیں زیادہ بڑی غلطیوں کا صدور تم سے نہ ہوگا' یا جو لغزشیں یا کوتاہیاں دوسروں سے ظاہر ہوئیں تم ان سے محفوظ رہو گے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عین ممکن ہے کہ جس طرح ماضی میں بہت سے لوگ دین کی خدمت کے داعیے کے تحت کھڑے ہوئے اور "اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی"[1] کے مصداق تھوڑے سے خیر کے ساتھ بہت سا شر پیدا کر گئے اسی طرح تم بھی کسی فتنے کی داغ بیل ڈال کر چلتے بنو..... لیکن ان خدشات و خطرات سے فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا اور خطرات کی پیش بندی کا یہ طریق تو بہرحال صحیح نہیں ہے کہ سرے سے کام ہی نہ کیا جائے۔ زندگی بذاتِ خود ایک عظیم چیلنج ہے جس کا مواجہہ ہر ذی حیات کے لئے لازم و لابد ہے۔ الّا آنکہ وہ زندگی ہی سے مستعفی ہو جائے۔ اسی طرح اسلام و ایمان بہت سی ذمّہ داریوں کا بوجھ انسان کے کاندھے پر لا ڈالتے ہیں جن کے شعور سے انسان پر بجا طور پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم  کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را

..... لیکن ان سے جی چرانا اور فتنوں کے اندیشے سے وہ روش اختیار کرنا جس پر

---

[1] سورۃ النجم آیت ۳۴: "اور دیا کچھ تھوڑا سا اور فوراً رک گیا!"

قرآن حکیم کا وہ فتویٰ راست آئے کہ "اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوا"[1] یقیناً دانش مندانہ روش نہیں!..... جن لوگوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ صلوٰۃ و صوم اور حج و زکوٰۃ کے علاوہ بھی دین کا کوئی تقاضا اور مطالبہ ہے' وہ تو شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی عذر پیش کر سکیں لیکن جن پر یہ بات منکشف ہو چکی ہو کہ شہادتِ حق اور اقامتِ دین بھی مسلمان کے دینی فرائض میں شامل ہیں اور وہ ان کے بارے میں عنداللہ مسئول ہیں ان کے لئے تو ایک ہی راہ ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت و حمایت کی امید پر اور اسی سے ہدایت و استقامت کی دعا کرتے ہوئے ان فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس کے سوا "مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ" کی بھی کوئی سبیل کم از کم قرآن حکیم سے تو معلوم نہیں ہوتی! گویا بقول شاعر۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب　　مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!

---

دوسری طرف بعض حضرات نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ تم لوگوں کے سامنے دین کے مطالبات تو بہت بلند و بالا بیان کرتے ہو لیکن ان کی ادائیگی کی کوئی عملی صورت ان کے سامنے نہیں آتی۔ تم نے خود جو کام عملاً شروع کیا ہے اس میں لوگوں کی شرکت کے مواقع بہت محدود ہیں۔ "تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن" میں بالفعل صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو عربی سیکھ سکیں اور قرآن کا علم اس حد تک حاصل کر سکیں کہ دوسروں تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب کے لئے ممکن نہیں۔ اب جو شخص نہ عربی سیکھ سکتا ہو نہ قرآن مجید کا درس دے سکتا ہو وہ تمہارا شریک کار بنے تو کیونکر؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضور صلی اللہ

---

[1] سورۂ توبہ کی آیت ۴۹: "ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہمیں رخصت عطا فرما دیجئے اور خواہ مخواہ کے امتحان میں نہ ڈالئے! آگاہ ہو جاؤ کہ امتحان میں تو وہ پہلے ہی مبتلا ہو چکے!"

علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

تمہارے درسِ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کا رکنِ لازم جہاد فی سبیل اللہ ہے، جس کی غایتِ اولیٰ فریضہ شہادتِ حق کی ادائیگی ہے اور غایتِ قصویٰ اعلاء کلمۃ اللہ اور غلبۂ دینِ حق کی جدّوجہد، لیکن تم یہ نہیں بتاتے کہ آخر ان فرائض کی ادائیگی کی عملی شکل کیا ہو؟ لوگ کیا کریں؟ کیسے جمع ہوں؟ کہاں سے سفر کا آغاز کریں؟ اور کس کی رہنمائی میں آگے چلیں؟ اگر تم ان سوالوں کا جواب نہیں دیتے اور لوگوں کے لئے عمل کی راہ نہیں کھولتے تو بجائے اس کے کہ تمہاری طرف سے ان پر حجت قائم ہو الٹی ان کی حجت تم پر قائم ہوئی جا رہی ہے!

بعض نے طنزاً اور بعض نے خلوص کے ساتھ یہ بھی کہا کہ تمہارے درسِ قرآن میں شریک ہونے والوں کی عظیم اکثریت محض روایتی اور رسمی طور پر حصولِ ثواب کی خاطر درس سنتی ہے۔ جیسے ہی تم نے عمل کے لئے پکارا اور "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" کی ندا دی تم خود دیکھ لو گے کہ ساری بھیڑ چھٹ جائے گی، گویا ع "دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!" تو اگرچہ ان کی یہ بات کلیتہً تو درست نہیں ہے اس لئے کہ متعدّد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ اس سلسلۂ درس سے منسلک ہو کر عملی اعتبار سے لوگوں کی زندگیوں میں عظیم انقلاب برپا ہو گیا، تاہم ادھر کچھ عرصے سے میں خود بھی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے حلقۂ احباب میں درسِ قرآن کے سلسلے کو واقعۃً ایک رسم اور روایت کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور گویا خود درسِ قرآن ہی مقصود بالذّات بنتا چلا جا رہا ہے اور بہت سے لوگ اسے اپنے معمول (Routine) میں داخل کر کے مطمئن ہو گئے ہیں!..... یہ واقعہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے دورِ انحطاط میں دین کے اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کو محض رسم بنا کر رکھ دینے کے فن میں یدِطولیٰ حاصل کیا ہے اور اس میں کوئی شک

نہیں کہ ہمیں اس میں مہارتِ تامہ حاصل ہے لیکن میں لرز جاتا ہوں اس خیال سے کہ اگر قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا محض ایک رسم بن کر رہ گیا تو پھر اور کون سی چیز رہ جائے گی جو لوگوں کو آمادۂ عمل کر سکے..... اور میں کانپ اٹھتا ہوں اس احساس سے کہ اگر لوگ سورۂ صف اور سورۂ حدید کو بھی 'پی' گئے اور ٹس سے مس نہ ہوئے اور سورۂ عنکبوت' سورۂ احزاب سورۂ منافقون اور سورۂ توبہ کو بھی بے سمجھے بوجھے نہیں بلکہ خوب سمجھ کر اور ایک بار نہیں بار بار پڑھ گئے لیکن معاملہ وہی رہا کہ ع "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمدؐ!" تو "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ"[1]

میرے لئے اس معاملے کا سب سے زیادہ قابلِ حذر پہلو یہ ہے کہ اگر لوگوں کی بے عملی اور ان کے تعطل و جمود میں کچھ دخل میری ہچکچاہٹ اور میرے تذبذب کو بھی حاصل ہوا تو کونسا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی! گویا میرے سامنے اب یہ معاملہ بالکل دو ٹوک طور پر آ چکا ہے کہ یا تو یہ صورت حال ختم ہونی چاہئے کہ "یہ صور پھونک کے تم سو گئے کہاں آخر!"[2] اور سیدھی طرح دین کے تقاضوں کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادائیگی کے لئے واضح لائحہ عمل بھی پیش کیا جائے اور خود راہ عزیمت پر پیش قدمی کر کے لوگوں کے لئے راستہ کھولا جائے یا پھر قرآن مجید کے اس انقلابی درس کا کام بھی کسی ایسے باہمت اور صاحبِ عزیمت انسان کیلئے چھوڑ دیا جائے جو محض درس ہی نہ دے' سامنے آ کر لوگوں کی رہنمائی کا فرض بھی انجام دے سکے! گویا میرے نزدیک اب صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" اور ع "یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر!"

---

[1] سورہ مرسلات کی آخری آیت: "اب اس کے بعد وہ آخر کس بات پر یقین لائیں گے؟"

[2] جناب نعیم صدیقی کا مصرعہ

اندریں حالات، جیسا کہ میں آغاز میں عرض کر چکا ہوں، میں نے اللہ تعالٰی کی تائید و توفیق کے بھروسے پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ میری مساعی صرف درس و تدریس اور تعلیم و تعلّمِ قرآن تک محدود نہیں رہیں گی بلکہ میں خالص دینی بنیادوں پر ایک نئی جماعت یا تنظیم قائم کرنے کی کوشش کروں گا جس میں وہ لوگ شامل ہوں جو:

اولاً...... اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے عائد کردہ حلال و حرام کی جملہ قیود کی پابندی کا عہد کریں اور اس معاملے میں رخصتوں کے بجائے عزیمت کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے آمادہ ہوں۔

ثانیاً...... 'سمع و طاعت' کے ٹھیٹھ اسلامی اصول پر مبنی نظمِ جماعت کی پابندی کا عہد کریں اور معروف کے دائرے کے اندر اندر اطاعتِ امیر کے التزام کے لئے پوری طرح آمادہ ہوں'...... اور

ثالثاً...... یہ عہد کریں کہ دنیوی زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت اور قوتِ لایموت پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی بہتر اور بیشتر مساعی اور اپنے اموال اور اوقات کا معتد بہ حصہ احیائے اسلام اور تجدیدِ دین کی کوشش اور شہادتِ حق اور اقامتِ دین کی جدّوجہد میں کھپا دیں گے۔

اپنی جگہ خود میں آپ سب کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ میرا جینا اور مرنا اللہ کے دین ہی کے لئے ہوگا اور میں ہر حال میں دین کو دنیا پر مقدّم رکھتے ہوئے اپنے بہتر اور بیشتر اوقات اور اپنی بہتر اور بیشتر قوتیں جیسی کچھ اور جتنی کچھ وہ مجھ میں ہیں اور بیشتر صلاحیتیں جیسی کچھ اور جتنی کچھ وہ مجھے حاصل ہیں، فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دینِ متین کی سعی و جہد کے لئے وقف کر دوں گا۔ گویا: ——————

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

اللہ تعالیٰ مجھے اپنے عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے' عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

---

اب آپ میں سے ہر شخص کو بھی اپنے آئندہ طرزِ عمل کے بارے میں واضح فیصلہ کرنا ہوگا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے اگر کوئی کامل رفاقت پر آمادہ ہو اور پوری طرح دست و بازو بننے کے لئے تیار ہو تب تو کیا ہی کہنے! "دیدہ و دل فرشِ راہ!" کوئی جزوی طور پر تعاون کرنا چاہے تو بھی سر آنکھوں پر' کوئی صرف دعاؤں اور نیک تمناؤں سے تائید کرے تو وہ بھی بسرو چشم قبول' اور اگر کوئی محض سامع کی حیثیت سے حسب سابق ہماری محفلوں اور مجلسوں کو رونق بخشتا رہے' تو وہ بھی شکریہ کا مستحق۔

..... لیکن اپنی جگہ آپ کو چند باتیں واضح طور پر سمجھ لینی چاہئیں:

اولین اور اہم ترین معاملہ دین کے مطالبوں اور تقاضوں کے بارے میں انشراحِ صدر کا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اس دعوتِ قرآنی سے کسی درجے میں بھی منسلک رہا ہو اسے اس سلسلے میں کوئی اشتباہ لاحق ہو سکے! جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس 'تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن' کا پورا اٹھان مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب کی اساس پر ہوا ہے جس کا مرکزی مضمون ہی یہ ہے کہ ازروئے قرآن انسان کی نجات کے لوازم کیا ہیں اور اللہ کی کتاب کی رُو سے ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں۔ اس منتخب نصاب کو میں سرزمینِ لاہور میں متعدّد بار بیان کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر کسی نے اسے تسلسل کے ساتھ ایک مرتبہ بھی پڑھ یا سن لیا تو اسے کم از کم اپنے دینی فرائض کے بارے میں ہرگز کوئی مغالطہ یا اشتباہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

آپ نے آج ہی یہ نصاب مکمل کیا ہے۔ ان بیس دنوں کے دوران میں قرآن

حکیم کے جو مقامات آپ نے پڑھے ان میں سے ایمان اور عمل صالح کے تفصیلی مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ذرا اس مرکزی مضمون کی ڈور پر نگاہ جمائیے جو گویا ان تمام مقامات کو پروئے ہوئے ہے تو بات پھر دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جائے گی۔

'سورۃ العصر' مختصر ترین سورتوں میں سے ہونے کے باوجود ایمان اور عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو بھی انسان کی نجات کی لازمی شرائط کی حیثیت سے پیش کرتی ہے' آیۂ برّ (سورۂ بقرہ: ۱۷۷) نیکی کے صرف اسی تصوّر کو مبنی بر صداقت قرار دیتی ہے جس میں بدی سے پنجہ آزمائی کرنا اور اسے میدان جنگ میں للکارنا لازماً شامل ہو' سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع اجتناب عن الشرک اور التزامِ توحید' شکرِ باری اور برّ والدین' اور ایمان بالمعاد اور اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ سورہ حٰم السجدہ میں دعوت الی اللہ کی پرزور ترغیب ملتی ہے۔ سورۂ حجرات کے آخری حصے میں یقین قلبی کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور اس میں جان اور مال کھپانے کو بھی ایمانِ حقیقی کے لوازم میں سے شمار کیا گیا ہے' سورۂ حج کا آخری رکوع "ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ" کے ساتھ "جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ" کا حکم بھی سناتا ہے اور اس کی غرض و غایت قرار دیتا ہے شہادتِ حق کو' بفحوائے الفاظِ قرآنی "لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" سورۂ صف پھر عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے کے لئے ایمان کے ساتھ ساتھ "وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ" کی شرط عائد کرتی ہے اور اس کا ہدف و مقصود قرار دیتی ہے غلبۂ دینِ حق کو' بفحوائے الفاظ قرآنی "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" اور محبوبیتِ خداوندی کی شرط کے طور پر پیش کرتی ہے اس کی راہ میں اس طرح جنگ کرنے کو گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں کہ کوئی رخنہ ڈالا ہی نہ جا سکے۔ سورۂ حدید دین کے تمام تقاضوں کو دو

الفاظ میں سمیٹ کر بیان کرتی ہے۔ ایک ایمان اور دوسرے انفاق اور یہاں انفاق سے مراد صرف انفاقِ مال نہیں بلکہ بذلِ نفس بھی ہے۔ چنانچہ اسی کی کوکھ سے فوراً ہی قتال بھی برآمد ہو جاتا ہے اور بالآخر ارسالِ رسل' انزالِ کتاب و میزان اور تخلیقِ حدید سب کی غرض یہ بیان ہوتی ہے کہ "وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ" یعنی اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی نصرت و حمایت میں سلاحِ جنگ ہاتھ میں لے کر سرکھف میدان میں نکل آئیں..... پھر سورۂ عنکبوت ہو یا سورۂ احزاب' سورۂ توبہ ہو یا سورۂ حدید سب اس راہ سے گریز اور اس کے شدائد و مصائب سے گھبرانے اور ہمت ہار جانے پر نفاق کی وعید سناتی ہیں جس کا انجام ہے: "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ"

تو بتایئے کہ آخر فرار کی راہ کون سی باقی رہ گئی؟[1] مجھے تو عافیت کی راہ صرف ایک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ انسان قرآن کو اول تو پڑھے ہی نہیں یا پڑھے تو کم از کم سمجھے نہیں۔ ورنہ قرآن تو جس صراطِ مستقیم یا سواء السبیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے ناگزیر سنگ ہائے میل وہی ہیں جو میں نے ابھی بیان کئے اور اس کی آخری منزل وہ ہے جو سورۂ احزاب میں بیان ہوئی یعنی یہ کہ یا تو انسان "فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ" کی فہرست میں شامل ہو کر سرخرو ہو جائے یا پھر "وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ" کے زمرے میں شریک ہو کر اپنی باری کا انتظار کرے۔ غالباً اسی احساس کے تحت کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے کہ:

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد　　یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد!

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ کسی مخلوق کی تصنیف یا تالیف نہیں' خالق کا کلام ہے' کسی انسان کے نظریات نہیں جو بدل بھی سکتے ہوں' قرآن کی آیاتِ محکمات ہیں

---

[1] جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ　　ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں (فیضؔ)

جو اٹل بھی ہیں اور غیر مبدل بھی' یہ ہزل نہیں قولِ فصل[1] ہے' پھر چیستاں نہیں کتابِ مبین ہے اور کسی مردہ زبان میں نہیں "لسانٍ عربیٍّ مبینٍ" میں ہے..... اور اچھی طرح جان لیجئے کہ اگر قرآن حکیم کے ان مقامات کو پڑھتے ہوئے آپ کے دل نے گواہی دی ہو کہ ان کا جو معنی و مفہوم اور مراد و مقصود میں نے بیان کیا ہے وہ حق ہے تو قرآن کی جانب سے ایک حجت آپ پر قائم ہو چکی۔ اب دو ہی راستے کھلے ہیں یا تو ان فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو جائیں اور قرآن کو اپنے حق میں حجت اور دلیلِ راہ بنائیں یا اس سے پہلوتہی کی روش اختیار کر کے اپنے خلاف حجت اور برہانِ قاطع بنالیں[2]۔ تیسری کوئی راہ ممکن نہیں!

دوسرا مسئلہ میرے ساتھ تعاون کرنے یا نہ کرنے اور میرا ساتھ دینے یا نہ دینے کا ہے تو سیدھی سی بات ہے اگر آپ کو کسی معقول سبب سے میرے خلوص و اخلاص پر اعتماد نہ ہو یا آپ کو میرے بارے میں کوئی حقیقی خدشہ اور واقعی اندیشہ لاحق ہو تو آپ ہرگز میرا ساتھ دینے پر مکلّف نہیں۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اس سے آپ کے فرائض بہرحال ساقط نہیں ہو جاتے۔ اگر آپ کو کسی اور پر اعتماد ہو تو اس کے ساتھ مل کر کام کریں ورنہ از خود کھڑے ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر کریں..... اور خود ایک قافلہ تشکیل دے کر سفر کا آغاز کر دیں۔

لیکن اگر آپ کے پاس کوئی معقول وجہ مجھ سے سوءِ ظن کی نہیں ہے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ میرا ساتھ دیں اور خواہ مخواہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ نہ بنائیں۔ اس معاملے میں آپ کا اصل مفتی آپ کا دل[3] ہے۔ اسے ٹٹولیے اگر وہ مجھ پر اعتماد کے حق میں رائے دے تو گویا ایک دوسری حجت آپ پر قائم ہو گئی اور آپ پر واجب

---

[1] "اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ" (سورۂ طارق)

[2] "اَلْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ" (الحدیث)

[3] "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ" (الحدیث)

ہوگیا کہ میرا ساتھ دیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ محض گریز اور فرار کی خاطر الزام و اعتراض سے یہاں تو آپ دامن بچا جائیں گے خدا کے یہاں معاملہ مشکل ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں مَیں آپ کو کھلی اجازت دیتا ہوں کہ میرے بارے میں جو شبہات بھی آپ کے دل میں آتے ہوں بلا جھجک بیان کریں اور جو دریافت کرنا ہو بلا تکلّف دریافت کریں خواہ وہ میرے حال سے متعلق ہو یا ماضی سے اور خواہ اس کا تعلّق میری پبلک لائف سے ہو خواہ نجی زندگی سے! لیکن یہ احتیاط بہرصورت ملحوظ رہے کہ مجھے وضاحت کا موقع دیئے بغیر میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ محض آپ کا سوءِ ظن ہو اور آپ سورۂ حجرات میں یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں کہ "اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ!"

---

اس موقع پر ابتداء میں خود بھی میں اپنے بارے میں بعض وضاحتیں کئے دیتا ہوں:

ایک یہ کہ میں عالمِ دین ہونے کا ہرگز مدّعی نہیں بلکہ مجھے اپنی کم علمی کا پورا اعتراف ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال مرحوم ؏ "میں نہ عارف' نہ مجدّد' نہ محدّث نہ فقیہ!" لہٰذا مجھے فقہی معاملات میں رائے دینے کا ہرگز کوئی شوق نہیں بلکہ میں صاف اقرار کرتا ہوں کہ مجھ میں اس کی اہلیت ہی موجود نہیں ہے..... میری کُل حیثیت قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم اور دین کے ایک ادنیٰ خادم کی ہے'

البتہ قرآن کے مطالعے سے مجھے یہ ضرور معلوم ہوگیا ہے کہ دین میں مقدّم کیا ہے اور مؤخّر کیا' اوّلیت کسے حاصل ہے اور ثانوی درجہ کس کا ہے' جڑ اور اصل کی حیثیت رکھنے والی چیزیں کون سی ہیں اور فروعات کی حیثیت کن کی ہے'

گویا 'حکمتِ دین' کے اس شعبے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حصہ عطا فرمایا ہے جس کی جانب اشارہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظِ مبارک میں ملتا ہے جو آپؐ نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے:
"اِن شِئتَ حدثتُکَ یامعاذ بِراَسِ ھٰذَا الاَمرِ و ذروۃِ السَّنام مِنہ" یعنی اے معاذ اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ہمارے اس کام (دین حق) کی جڑ اور اساس کیا ہے اور اس کی سب سے اونچی چوٹی کون سی ہے اور مجھے خالصتہً تحَدِیثًا لِلنِّعمَۃ یہ عرض کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس معاملے میں بحمد اللہ مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد حاصل ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ جانتا ہوں کہ اس امّت نے کس طرح دین کی جملہ اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے اور اصل کو فرع اور فرع کو اصل کا درجہ دے کر فرائضِ دینی کا پورا تصوّر ہی مسخ کر دیا ہے۔ نتیجۃً حضرت مسیح کے الفاظ میں "مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں" اور ایک عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ انہیں نہ "راس ہذا الامر" سے کوئی بحث ہے نہ "ذروۃ السنام منہ" سے کوئی دلچسپی۔ صرف کچھ درمیانی اعمال اور ان کے بھی محض ظاہر کو کُل دین سمجھے بیٹھے ہیں۔ گویا نہ جڑ کا دھیان نہ چوٹی کی فکر' تنے کی بھی صرف چھال نے کل دین کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب ساری بحث و تمحیص' قیل و قال' مناظرہ و مجادلہ اور تحقیق و تفحّص کا موضوع صرف رفع یدین' آمین بالجہر اور تعدادِ رکعاتِ تراویح ایسے فروعی مسائل بن کر رہ گئے ہیں!...... اور میں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اصلاحِ احوال کی کوئی صورت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس معاملے میں نسبت و تناسب کو از سرِنو درست کیا جائے' چنانچہ آپ کو بھی میرا مشورہ یہ ہے کہ فروعات کے باب میں اہل سنّت کے جس مسلک پر آپ چاہیں عمل پیرا ہوں اور فقہی معاملات میں اپنے ہم مسلک علماء ہی کی جانب رجوع کریں۔ البتہ دوسروں کے لئے وسعتِ قلب پیدا کریں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف سے دل

گرفتہ نہ ہوں..... البتہ دین کی جڑ اور اس کے 'ذروۂ سنام' کے بارے میں کوئی اشکال یا اشتباہ ہو تو مجھے وضاحت کا موقع دیں۔ پھر اگر آپ کا دل مطمئن ہو تو میری بات قبول کرلیں ورنہ میرے منہ پر دے ماریں۔

دوسرے یہ کہ مجھے اپنی عملی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بھی بخوبی علم ہے اور مجھے نفسِ مزکّی ہونے کا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے "من آنم کہ من دانم!" اور جیسا کہ میں تفصیلاً عرض کرچکا ہوں یہی وہ احساس تھا جو مجھے اب تک اس راہ میں پیش قدمی سے روکے رہا اور اب بھی اقدام کی جرأت کر رہا ہوں تو صرف اس دعا کے سہارے کہ "رَبِّ اٰتِ نَفْسِیْ مَدَاھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا" اپنے بہت سے عیوب پر تو میں خود بھی مُطّلع ہوں اور ان کو دور کرنے کی امکان بھر سعی کروں گا۔ مزید پر جو بھی مجھے متنبّہ کرے گا اس کا شکریہ ادا کروں گا اور انشاء اللہ العزیز اس کی بھی اصلاح کی سعی کروں گا بِیَدِہِ التَّوْفِیْقُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ!

تیسرے یہ کہ میرا ایک ماضی بھی ہے جس سے دستبردار ہونے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں۔ اس لئے کہ مجھے اس پر نہ کوئی ندامت ہے نہ پشیمانی۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے اپنا جو وقت جمعیتِ طلبہ یا جماعت اسلامی میں صرف کیا وہ ہرگز ضائع نہیں ہوا۔ اور اپنی جو قوتیں اور صلاحیتیں ان میں کھپائیں وہ قطعاً رائیگاں نہ گئیں۔ اس لئے کہ میں نے یہ کام خلوص کے ساتھ محض خدمتِ دین کے جذبے کے تحت کیا لہٰذا اللہ کے یہاں میرا اجر بالکل محفوظ ہے۔ میں وہاں تھا تو اللہ کے لئے تھا اور وہاں سے نکلا تو بھی صرف اللہ کے لئے نکلا۔ کسی سے ذاتی نوعیت کی کوئی شکایت یا نجی قسم کی کوئی رنجش اس علیحدگی کا باعث نہیں بنی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج آپ کے سامنے اپنا پورا ماضی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور اپنی امکانی حد تک اس میں سے کسی چیز کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد بھی میں یہ چاہتا ہوں کہ جو حضرات اس کام میں میرا ساتھ دینے کا کوئی ارادہ یا خواہش

دل میں پاتے ہوں وہ میری کتابیں "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" اور "تاریخ جماعت اسلامی کا گمشدہ باب" ضرور نظر سے گزار لیں۔ مبادا کوئی چیز بعد میں ان کے علم میں آئے اور وہ جز بز ہوں۔ پھر ان کے مطالعہ کے بعد بھی کوئی اشکال ذہن میں رہ جائے تو میں حاضر ہوں وضاحت طلب کیجئے اور کامل اطمینان کے بعد ہی رفاقت اختیار کیجئے!

آئندہ کام کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے اس کو سمجھنے کے لئے میں درخواست کروں گا کہ ایک تو میرے کتابچے "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام" کا مطالعہ پوری توجہ کے ساتھ کر لیا جائے' جو طبع شدہ موجود ہے' اور دوسرے ۶۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کی جو سعی ہم نے کی تھی اس کی قرارداد اور اس کی توضیحات بھی غور سے پڑھ لی جائیں اور اس پر جو تقاریر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن نے کی تھیں ان کو بھی نظر سے گزار لیا جائے[1] وہ قرارداد اور اس کی توضیحات دراصل میں نے ہی لکھی تھیں جنہیں معمولی سی لفظی ترامیم کے ساتھ اجتماع نے اختیار (Adopt) کر لیا تھا اور میں ان پر آج بھی اتنا ہی مطمئن ہوں جتنا اس وقت تھا۔

رہا آئندہ کا تفصیلی لائحہ عمل..... اور ہیئتِ تنظیمی کی مفصّل صورت تو ان مسائل کے بارے میں مَیں اس وقت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ ان کا دارومدار کلیتہً اس پر ہے کہ کتنے لوگ تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں اور کتنی کچھ صلاحیتوں اور قوتوں کا سرمایہ جمع (Pool) ہوتا ہے۔

آخر میں "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللہ!" کے سوال پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں اس وضاحت کے ساتھ کہ مجھے اس کا کوئی فوری جواب مطلوب نہیں۔ اگر صرف جذبات میں ہاں کرا لینے کی خواہش ہوتی تو شاید میں ابھی آپ سب کے ہاتھ کھڑے کرا لیتا۔

---

[1] یہ تمام چیزیں "تعارف تنظیم اسلامی" نامی کتاب میں شامل ہیں۔

لیکن مطلوب اصل میں یہ ہے کہ:

جو آئے خوب سوچ سمجھ کر آئے۔ دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کے بعد آئے اور پھر آئے تو تحفظات کے ساتھ نہ آئے بلکہ تن، من، دھن سب کے ساتھ آئے اور یہ اچھی طرح جان کر آئے کہ ؎

در رہِ منزلِ لیلےٰ کہ خطر ہاست بسے
شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

## تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام

مرکزی دفتر واقع ۶۷۔اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور میں منعقد ہونے والی آئندہ

# تربیت گاہوں کا شیڈول

### مبتدی تربیت گاہ

① ۱۰ر تا ۱۶ر مئی ۱۹۹۱ء
② ۵ر تا ۱۱ر جولائی ۱۹۹۱ء
③ ۶ر تا ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۱ء
④ ۸ر تا ۱۴ر نومبر ۱۹۹۱ء
⑤ ۳ر تا ۹ر جنوری ۱۹۹۲ء

### ملتزم تربیت گاہ

① ۷ر تا ۱۳ر جون ۱۹۹۱ء
② ۹ر تا ۱۵ر اگست ۱۹۹۱ء
③ ۴ر تا ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۱ء
④ ۶ر تا ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۱ء
⑤ ۷ر تا ۱۳ر فروری ۱۹۹۲ء

# تنظیمِ اسلامی کے سولہویں سالانہ اجتماع کے اختتامی اجلاس میں

## رفقاءِ تنظیم کے لیے

# امیرِ تنظیم کا الوداعی تحفہ

(سورۃ الاعراف، آیات ۴۲-۴۳)

اجتماع کے اختتام پر میں آپ حضرات کو سورۂ اعراف کی اِن دو آیات کا خصوصی تحفہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص رہنمائی ہے کہ اس نے مجھے اس موقع پر ان دو آیات کا انتخاب سجھا دیا جو میں سمجھتا ہوں کہ اِس وقت ہمارے لئے بہت مناسبِ حال ہیں۔

اِن دونوں آیات میں آپ کو یہ اسلوب ملے گا کہ آیت کے اصل مضمون کے درمیان میں ایک ضمنی بات بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں "Principal Clause" تو یہ ہوگی:

**وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ..... اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○**

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ..... وہ جنّت والے ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے!"

جبکہ **"لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"** کی حیثیت ایک جملۂ معترضہ یا ضمنی بات کی ہے، جو اپنی جگہ انتہائی اہم ہے۔

قرآن مجید کے متعدّد مقامات کی طرح یہاں بھی **"الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا"** کے ساتھ **"وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"** کا ذکر موجود ہے۔ توجّہ طلب بات یہ ہے کہ یہاں "اعمالِ صالحہ" سے مراد کیا ہے؟ ہمارے ذہنوں میں عملِ صالح کا کچھ اور نقشہ جم گیا ہے۔ اس آیت پر غور کرتے ہوئے سوچئے کہ اِس کے نزول کے وقت **"عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"** کا مطلب کیا تھا۔ سورۂ اعراف مکّی ہے اور اس کے نزول کے وقت تک شریعت کے تفصیلی احکام ابھی نازل ہی نہیں ہوئے تھے۔ نہ شراب حرام تھی، نہ سُود حرام تھا۔ اور اگر اس کا زمانۂ نزول ۱۱ نبوی سے قبل کا ہے تو اُس وقت تک ابھی نماز بھی فرض نہیں تھی اور روزے کا تو وجود ہی

نہیں تھا۔ تو ایسے میں عملِ صالح سے کیا مراد تھی؟ اُس وقت اہلِ ایمان کے لئے عملِ صالح کا مفہوم دین کی دعوت و اشاعت اور اس پر استقامت اختیار کرنا اور رات کو قرآن کے ساتھ جاگنا تھا۔ ان تین کاموں کے علاوہ بنیادی انسانی اخلاقیات مثلاً سچ بولنا' ایفائے عہد' پاسِ امانت' غریبوں کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ اور بھوکوں کو کھانا کھلانا وغیرہ اعمالِ صالحہ کے دائرے میں شامل تھے۔ ان بنیادی انسانی اخلاقیات کو تو اُس معاشرے میں پہلے ہی سے نیکی کے کام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ایمان لانے والوں کو ان کے ساتھ ساتھ جو اصل کام کرنا پڑتا تھا اس کے تین نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں: (۱) صبر و استقامت۔ یعنی اپنے دعوائے ایمان پر اس طرح مضبوطی سے جم جانا اور ڈٹ جانا کہ شدید ترین تکالیف اور بدترین تشدّد اور Persecution سے بھی پاؤں متزلزل نہ ہو سکیں۔ (۲) جس دینِ حق کو خود قبول کیا ہے اس کی طرف دوسروں کو دعوت۔ (۳) اپنی روحانی قوت میں اضافے کے لئے راتوں کو کھڑے ہو کر "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا" کے حکم پر عمل پیرا ہونا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مقام پر "عملِ صالح" کا یہ مفہوم معیّن کرتے ہوئے میں احکامِ شریعت پر عمل کی نفی نہیں کر رہا۔ اب واقعۃً ہماری تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ شریعت پر عمل کرنا ہے۔ لیکن اِس وقت میں آپ کو اس آیۂ مبارکہ کا پس منظر سمجھا رہا ہوں تاکہ ہمارے سامنے نسبت و تناسب واضح ہو جائے۔

اب ہم اس آیت کے درمیان میں آنے والی 'ضمنی بات' پر توجّہ مرکوز کرتے ہیں۔ میں یہ بارہا بیان کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم میں اہم ترین حکیمانہ باتیں ضمنی طور پر آئی ہیں۔ یہاں فرمایا گیا:

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

"ہم کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرائیں گے' مگر اس کی وسعت کے مطابق!"

یعنی عملِ صالح کے ضمن میں یہ خوشخبری حاصل کر لو کہ ہم کسی کو اس کی استطاعت اور استعداد سے بڑھ کر ذمہ دار نہیں ٹھہرائیں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہاں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ہر شخص سے اس کی اپنی مقدرت' وسعت اور استعداد کے مطابق حساب ہوگا۔ البتہ اس میں یہ خطرہ موجود ہے کہ ہم اپنی وسعت کا صحیح اندازہ نہ کر پائیں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم میں دین کا کام کرنے کی صلاحیت و استعداد ہی موجود نہیں ہے' جبکہ دنیا کے لئے ہم خوب بھاگ دوڑ اور محنت و کوشش کر رہے ہوں۔ یہ طرزِ عمل

سراسر خود فریبی پر مبنی ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا:

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ

"اور کھینچ نکالیں گے ہم ان کے دلوں میں سے جو کچھ بھی (باہمی) کدورت ہوگی۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی"۔

معلوم ہوا کہ دلوں میں رنجش اور کدورت کا پیدا ہو جانا ایک بالکل طبعی اور فطری امر ہے۔ چنانچہ ایک وقت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین بھی یہ معاملہ اتنا شدید ہوا کہ باہم قتال کی نوبت آگئی۔ البتہ جنت میں داخلے سے پہلے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے دلوں کو ہر قسم کی باہمی کدورت سے پاک فرما دیں گے۔ یہی مضمون سورۂ حجر کی آیت ۴۷ میں ان الفاظ میں آیا ہے:

"وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ"

جس کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ اس آیت میں میرا اور معاویہؓ کا ذکر ہے۔ جب ہم دونوں جنّت میں داخل ہوں گے تو اللہ ہمارے دلوں میں موجود باہمی 'غِل' کو نکال دے گا۔

تو سمجھ لیجئے کہ رفقائے تنظیم کے مابین بھی 'غِل' کا پیدا ہو جانا کوئی غیر طبعی اور غیر فطری بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بہت ضروری ہے کہ کسی قسم کی کدورت اور خلش کو برقرار نہ رہنے دیا جائے۔ ہر رفیقِ تنظیم کو شعوری طور پر اس کا مراقبہ کرتے رہنا چاہئے۔ سالانہ اجتماع کے اس موقع پر خاص طور سے ہمیں اپنے دلوں کو صاف کر کے جانا چاہئے۔ یہاں تمام رفقاء تین چار روز تک ایک ساتھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران زبان یا عمل سے آپس میں کوئی اونچ نیچ' کمی بیشی یا زیادتی ہو گئی ہو۔ چنانچہ خاص طور پر ان چار دنوں میں کوئی 'غِل' اگر کسی درجے میں پیدا ہو گیا ہو تو ہم سب کو اسے شعوری طور پر صاف کر کے یہاں سے رخصت ہونا چاہئے۔

آیت کا اگلا ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ

"اور وہ کہیں گے: کُل شکر اس اللہ کا ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی۔ اور ہم (از خود) ہدایت پانے والے نہ ہوتے اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی"۔

اہلِ جنّت جب جنّت میں داخل ہوں گے تو اللہ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر و سپاس کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہمارا یہاں تک پہنچ جانا کوئی ہماری اپنی کوشش و محنت کا نتیجہ نہیں ہے' بلکہ درحقیقت ہمیں اللہ نے یہاں پہنچایا ہے۔ اُسی نے راہِ حق کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی' اسی نے ہمیں اُس راہِ ہدایت پر گامزن رکھا اور اُسی نے گویا انگلی پکڑ کر ہمیں اِس مقام تک پہنچا دیا۔ ہمارے اپنے اعمال تو ایسے نہ تھے جن کی بدولت ہم جنت کے مستحق بن سکتے۔

یہ قول اصلاً تو اُس مرحلے سے متعلق ہے جب اہلِ جنّت جنّت میں داخل ہوں گے' لیکن یہ قول اس دنیا میں بھی قدم قدم پر ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے ——— چنانچہ جب بھی کوئی خیر میسّر آئے' کوئی علمی نکتہ ہاتھ لگے' بھلائی کیلئے کسی درجے میں بھی شرحِ صدر نصیب ہو' الغرض قولاً' عملاً یا علماً نیکی و بھلائی کی کوئی بھی توفیق ملے تو ہمیشہ زبان پر یہ کلمات آ جانے چاہئیں: **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ** ——— کہ یہ علم ہماری دسترس میں کہاں تھا' اس معرفت اور حکمت تک رسائی ہم کہاں حاصل کر سکتے تھے' یہ نیکی و بھلائی اور یہ ایثار و قربانی ہم سے کہاں بن آ سکتی تھی! یہ تو سراسر اللہ کا فضل و کرم اور اس کی عطا اور دین ہے۔

اسی حوالے سے مجھے اپنے اسلامی جمعیت طلبہ کے دور کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ جمعیت کے ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۲ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر خرم جاہ مراد صاحب نے (جو اب جماعت اسلامی کے نائب امیر ہیں۔ اور جن سے میرا عزیز داری کا تعلق بھی ہے) اپنی آٹو گراف بک میرے سامنے کر دی۔ میں اگرچہ ان چیزوں کا عادی نہیں تھا' لیکن اُس وقت میں نے اُن کی آٹو گراف بک میں جو الفاظ لکھے تھے وہ خود میرے اپنے دل پر اُسی وقت نقش ہو گئے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے:

> "کبھی کبھی میرا دل ایسے لوگوں کے تصوّر سے کانپ اٹھتا ہے جو کبھی تحریک اسلامی کی اولین صفوں میں تھے اور آج اسی نسبت سے اس سے دور جا چکے ہیں۔ میں خود "**اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ**" کے بعد اب "**رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ**" کا سہارا لیا

کرتا ہوں اور اسی کا مشورہ میں اپنے عزیز ترین دوستوں کو دیتا ہوں"۔

میں چاہتا ہوں کہ یہی الفاظ آپ بھی اپنے دل پر نقش کر کے اٹھیں۔ آپ کو تنظیم میں آنے کی جو توفیق ملی ——— ایک جذبہ پیدا ہوا' ایک فکر ذہن کے سامنے آیا' جس پر دل نے گواہی دی' اور آپ اس قافلۂ تنظیم میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کے قدم کچھ آگے بڑھے۔ اس سب پر اللہ کا شکر ادا کیجئے اور ڈریئے اس سے کہ کہیں معنوی ارتداد یا پسپائی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ تاہم خلوصِ نیت کے ساتھ اختلاف کا پیدا ہونا اور علیٰحدگی تک کی نوبت آ جانا بالکل دوسری بات ہے۔ اسے پسپائی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص خلوص و اخلاص کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے کسی جماعت سے علیٰحدہ ہوتا ہے وہ وہاں سے جا کر اُس وقت تک بے چین و بے قرار رہتا ہے جب تک وہ کسی دوسرے متحرک قافلے میں شریک نہیں ہو جاتا یا ازخود کوئی قافلہ تشکیل نہیں دے لیتا۔ اس کے برعکس اگر وہ معاشرے میں گم ہو کر رہ جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ کمی کہیں خود اسی میں تھی۔ ورنہ وہ دین کی اس جدّوجہد سے دستکش نہ ہوتا اور اس راہ میں اور کچھ نہ کر سکتا تو ع "بازی اگرچہ پا نہ سکا' سر تو دے سکا" کے مصداق اپنا سر تو پیش کر سکتا تھا۔ مجھے غالبؔ کے اِس خیال سے ہرگز اتفاق نہیں ہے جو اس نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے کہ ؎

وفا کیسی' کہاں کا عشق' جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

میرا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب سر ہی پھوڑنا ہے تو پھر کہیں اور جا کر کیوں پھوڑیں؟ اسی "سنگِ آستاں" پر ہی کیوں نہ پھوڑیں؟ زندگی میں ہر کسی کو سر ہی تو پھوڑنا ہوتا ہے۔ اگر کسی کاروبار' ملازمت یا کسی اور دھندے میں سر پھوڑنا ہے تو کیوں نہ دین کے لئے سر پھوڑا جائے! کاروبار اور تجارت میں کتنے لوگ کامیاب ہوتے ہیں؟ سر توڑ محنت اور کوشش سبھی کرتے ہیں' لیکن ان میں کوئی ایک ہی کروڑ پتی بنتا ہے' جبکہ کتنے ہی لوگ تجارت میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی دین کی جدّوجہد میں اگر بظاہر ناکام ہو جائیں اور آپ کی جہد و کوشش کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے تو کوئی پروا نہیں۔ لوگ دنیا کی خاطر سر پھوڑتے ہیں' آپ دین کی خاطر پھوڑیں۔ اس راہ کو چھوڑ کر اور کہاں جانا ہے؟

بہرحال اس جدّوجہد میں ایک تو یہ احساس مدِّنظر رہنا ضروری ہے کہ اسی نے ہمیں اس کی توفیق دی' ہم اس قابل نہ تھے۔ اس نے غیب سے ہمارے لئے اسباب فراہم کر دیئے اور راہِ حق کی طرف ہماری رہنمائی فرما دی۔ اور دوسرے یہ کہ اب ہمارا تکیہ اور سہارا اپنی صلاحیت' لیاقت' استقامت اور بہادری پر نہ ہو' بلکہ اس راہ پر مستقیم رہنے کے لئے اللہ کے حضور دعا کی جائے: "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ" ------ یعنی اے پروردگار جب تو نے ہی ہمیں ہدایت عطا کی ہے تو اس کے بعد اب ہمارے دلوں کو کج نہ کر دیجیو اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کیجیو۔ بیشک تو بڑا عطا فرمانے والا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام انسانوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے مابین ہیں۔ چنانچہ ہمیں اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہئے: "يَا مُثَبِّتَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ' يَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلٰى طَاعَتِكَ"۔

زیر نظر آیت کا اگلا ٹکڑا پیش کر رہا ہوں:

لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ

"یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر ہی آئے تھے"

کاش کہ ہم میں سے ہر ایک کا دل اس پر صد فیصد یقین کے ساتھ گواہی دے سکے کہ ہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں! اور قرآن حق ہے! آنحضور کی تہجد کی دعاؤں میں سے یہ دعا میں آپ کو کئی مرتبہ سنا چکا ہوں کہ آپ کہا کرتے تھے: اَنْتَ الْحَقُّ' وَوَعْدُكَ الْحَقُّ' وَقَوْلُكَ حَقٌّ' وَلِقَآؤُكَ حَقٌّ' وَالْجَنَّةُ حَقٌّ' وَالنَّارُ حَقٌّ' وَالسَّاعَةُ حَقٌّ' وَ مُحَمَّدٌ حَقٌّ' وَالْقُرْاٰنُ حَقٌّ۔ اگر دل یہ گواہی دے رہا ہے تو کیا کہنے! ایسا دل مبارکباد اور تہنیت کے لائق ہے!

اہلِ جنت کو اب اللہ کی طرف سے جو جواب ملے گا وہ آیت کے آخری ٹکڑے میں بیان کر دیا گیا ہے:

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

"اور وہ ندا دیئے جائیں گے کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو ان اعمال کی بدولت جو تم (دنیا میں) کرتے تھے"۔

یہ جواب اللہ تعالیٰ کی شانِ شکوری کا مظہر ہے کہ جنت کو اہلِ جنت کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے عمل کو حقیر سمجھیں اور راہِ حق میں جو کچھ بھی جہد و کوشش ہم سے بن آئے اسے اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم اور اس کی توفیق و تیسیر قرار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدردانی اور قدر افزائی کا مظہر ہے کہ وہ اپنے بندے کے اعمال کا حوالہ ہی دے گا کہ محنت اور جدّوجہد تم نے کی تھی' میرے راستے میں ایثار و قربانی تم نے کی تھی' ہماری توفیق و تیسیر ضرور تمہارے شامل حال رہی اور ہم نے تمہاری کوتاہیوں کی تلافی بھی کی ——— لیکن تمہیں جس انعام و اکرام سے نوازا جا رہا ہے یہ تمہارے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ آمین! **وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین** ○○

---

## بقیہ : 'عرضِ احوال'

تعلیم مکمل کرنے والا طالب علم انگریزی' عربی اور اردو تینوں زبانوں میں عام کالجوں کے طلبہ کی نسبت بہت بہتر استعداد کا حامل ہوگا۔

قارئین نوٹ فرمالیں کہ قرآن کالج میں ایف اے کلاس کے آئندہ داخلے معمول کے مطابق یعنی میٹرک کا رزلٹ نکلنے کے بعد ہی ہوں گے۔ داخلوں کے لئے میرٹ کا تعین کیا جائے گا اور میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کو ہی معیار نہیں بنایا جائے گا بلکہ طلبہ کی لیاقت کو جانچنے کے لئے ایک درمیانے درجے کا داخلہ ٹسٹ بھی لیا جائے گا جس کے بعد طلبہ کو انٹرویو کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ کالج میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے مندرجہ بالا اقدامات ناگزیر قرار پائے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ اس طرح بہت کم طلبہ قرآن کالج کی جانب مائل ہوں گے تاہم ہماری نظر میں اصل اہمیت کیت (Quantity) کی نہیں کیفیت (Quality) کی ہے۔ ہمارے پیشِ نظر دوسرے کالجوں کی مانند محض ایک کالج کھولنا نہیں ہے کہ جس کا مقصود اس کے سوا اور کچھ نہ ہو کہ ایف اے اور بی اے کے نصاب کی تیاری اس انداز پر کرا دی جائے کہ طالب علم امتحان میں پاس ہو سکے' قطع نظر اس سے کہ ان میں قابلیت اور لیاقت کا ایک حبہ بھی پیدا ہو

سکے' بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے کالج میں طلبہ کے علمی معیار کو بلند کرنا اور کالجوں کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان اور ترجمہ قرآن کے ساتھ آراستہ کرنا ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقصد میں کامیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

---


طالبان قرآن کے لیے خوش خبری

اِن شاء اللہ العزیز ___ اس سال ماہ رمضان المبارک میں

# ڈاکٹر اسرار احمد

## نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن

# کراچی میں انجمن کے زیرِ تعمیر قرآن اکیڈمی

واقع خیابانِ راحت، درخشاں، مرحلہ ۶ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی

میں مکمل کریں گے ___ اور ___ اس کے ساتھ اسی مقام پر

ہفتہ ۱۶ مارچ تا ہفتہ ۱۳ اپریل ۱۹۹۱ء

# اقامتی قرآنی تربیت گاہ

بھی منعقد ہوگی۔ جس میں رات کے 'بیان القرآن' پر مذاکرے کے علاوہ دیگر تعلیمی اور تدریسی پروگرام بھی جاری رہیں گے اخراجات طعام ۵۰۰/- روپے ہوں گے۔ چونکہ اقامتی گنجائش بہت محدود ہے، اور ایک محدود تر تعداد میں غیر مستطیع شرکاء کی مفت ضیافت کی کوشش بھی کی جائے گی۔ لہٰذا شرکت کے خواہشمند حضرات زیادہ سے زیادہ یکم مارچ تک اپنی عمر اور تعلیمی استعداد کی تفصیل اور مستطیع یا غیر مستطیع کی صراحت کے ساتھ درج ذیل پتہ پر ارسال کریں

زین العابدین جوّاد۔ صدر انجمن خدّام القرآن سندھ

۱۱۔ داؤد منزل، فرئیر روڈ، نزد آرام باغ، کراچی (فون: ۲۱۶۵۸۶)


---

## جماعت اسلامی کی موجودہ تنظیمی کیفیت پر

# جناب نعیم صدیقی کی گرفت

## جس میں جملہ دینی تنظیموں کے لئے قیمتی رہنمائی موجود ہے

(ماخوذ از ماہنامہ "ترجمان القرآن" جنوری ۱۹۹۱ء)

ہم نے ۱۹۴۱ء سے طریق انبیاء علیہم السلام پر کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا' اور ایک لمبا عرصہ ہر قسم کی تنگ حالی اور مصائب کے باوجود بہت اطمینان سے گزرا۔ کبھی ذہن الجھا نہیں کہ کہیں ہم صحرائے حیات کی یونہی آوارہ گردی تو نہیں کر رہے یا جادۂ اقدام کو بار بار بدل کر تجربے تو نہیں کر رہے اور ان تجربوں کی وجہ سے ہم اپنے مقصد و منزل کی سمت کھو تو نہیں بیٹھے۔ نہ ہمیں کبھی رتی بھر یہ شبہ ہوا کہ ہماری گاڑی کے ڈرائیور کہیں اپنے نئے ذہنی منصوبوں پر تو نہیں چل پڑے اور ساتھ ہمیں بھی گھسیٹ نہیں رہے۔ نہ یہ اندیشہ کہ جو کوئی بھی سربراہ بنا وہ رفتارِ نتائج کو بدلنے کے لئے طریقِ انبیاء میں تغیر کر کے کوئی نیا راستہ دریافت کرنے کے چکر میں ہوتا کہ کوئی اچنبھے کا کام کر دکھائے۔ کبھی ہمارا تشخص دھندلایا نہیں۔ اصول' قدریں اور معیارات بدلے نہیں' کبھی دوسروں کی ریس اور نقالی کا رجحان ہم میں نہیں پیدا ہوا جو احساس کہتری کا نتیجہ ہوتا' کبھی مایوسی نہیں ہوئی کہ اب ہمارے لئے دعوت کا میدان تنگ ہو گیا ہے اور ہمارے دہقان مزاج کارکن نیری لگانے کے تھکا دینے والے بے کیف کام میں فرار کرنے لگے ہیں۔ کبھی اجتماعی فیصلوں میں دھندلا پن یا دو رخا پن ایسا نہیں پایا گیا جو ہمارے ساتھیوں کو الجھا دے۔ کبھی عام حلقوں میں شکوک و شبہات اور چہ میگوئیاں فروغ نہیں پا سکیں۔ ہمارے ہاں سیاست کا کام پہلے سے ہو رہا تھا مگر اس کی باگ ڈور دین کے ہاتھ میں تھی اور ساری سرگرمیاں دینی مفاد اور تقاضوں کے مطابق ہوئیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا آج بھی عین مَین یہی حالت ہے اور آئندہ بھی ہم اس کو نبھا سکتے ہیں؟

طریقِ انبیاءؑ (اور اسوۂ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق صلاح و فلاح کا کام کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک تو ملت کی بہبود اور پوری انسانیّت کی تعمیرِ نو کے لئے دعوت الی اللہ کے واحد طریق کو اہمیتِ کاملہ دی جائے' باقی جو کچھ بھی ہو اسی دعوت کے فروغ اور اسی کے عروج اور اسی کے اثر و نفوذ کے لئے ہو۔ جس کام کا ماحصل بندے کا خدا سے رابطہ نہیں' وہ خارج از بحث ہے۔

طریقِ انبیاءؑ (اور اسوۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا دوسرا مطالبہ میرے مطالعہ کی رو سے یہ ہے کہ تقریروں اور جلسوں' یا تحریروں اور جرائد و کتب سے جتنا کچھ بھی معاشرے کے ذہنی ماحول پر اثر ڈالا جا سکے' ہر حال میں فرد بہ فرد ملنے اور گفتگوئیں کرنے کے سلسلے کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ اجتماعی حالات اور سرگرمیاں جو کچھ بھی رہیں' اس بنیادی طریقِ کار کو کبھی ترک نہ کیا جائے' اور اگر کچھ لوگوں کو تحریک دلانے کی ساری کوششیں ناکام ہو جائیں تو ان کو متفق یا حامی کارکنوں کے مقام پر کام سنبھالنے کا مشورہ دے کر رکنیّت کے بارِ گراں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ ماسوائے ایسے محبّانِ تحریک کے جن کے پاس کوئی واضح عذر ہو اور اسے متعلقہ حلقۂ جماعت قبول کرے۔

اس کام کا کوئی اور شارٹ کٹ نہیں ہے۔ جتنے افراد کو آپ پوری طرح دین کے لئے مسخر کر لیں گے' وہی کچھ آپ کی اگلی طاقت ہوں گے' ورنہ جلدی ہو تو بَس بہت ملے گا۔

---

طریقِ انبیاء (بہ شمولیتِ اسوۂ حسنہ) کے تحت دعوتِ حق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ داعیانِ الٰہی اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں ایک گونہ رنگِ درویشی اختیار کریں۔ ورنہ افراد کی شاندار زندگیاں اور مسرفانہ تقاریب اور تحریک کی مرعوب کن نمائش کاریاں لازمی طور پر مردانِ کار کو ایثار و قربانی کی روش چھوڑ کر دولت سمیٹنے کی طرف متوجہ کر دیں گی جس سے نہ صرف تحریک کا کام ثانوی اہمیت اختیار کر لے گا بلکہ افراد میں حصولِ دولت اور حصولِ مفاد کی ایک ایسی ریس لگے گی جو جماعت کے اندر بھی اثر انداز ہوگی۔ یہ تسلیم کہ تبدیلیٔ تمدّن سے معیارات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں مگر ان تبدیلیوں کے بعد بھی طبقۂ غربا' درمیانہ طبقہ اور طبقۂ اعلیٰ موجود ہیں۔ کم سے کم آج کے معیارات کے لحاظ سے بھی درمیانہ طبقہ کی حدوں میں رہنا' بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ نچلے درمیانہ طبقہ میں رہا

جائے۔ اس سے غریب عوام سے رابطہ آسان ہو جاتا ہے اور مفاد اور آرام کی قربانی دینا اور مشقت کرنا بھی دل پسند بن جاتا ہے۔ ایسے درویش مزاج لوگوں میں اگر دولت کے دروازے کھلیں بھی تو وہ حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور جناب ابوالدحداحؓ جیسے کردار نمودار ہوں گے جو دولت کو تحریک کے قدموں میں بھی ڈالیں گے اور اہلِ حاجت پر بھی قربان کریں گے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز بھی تو تھے جن کے دور میں تمدن زمانۂ نبوت سے بہت ترقی کر گیا تھا' مگر دریائے تمدن ایک طرف بہتا رہا اور اس کے ساحل میں ایک درویش خلیفہ نے اپنا بوریائے خلافت بچھایا اور راہبوں جیسی زندگی گزار دی۔

آج ان کہانیوں کو ہم لوگ جب اسٹیجوں یا جرائد سے معاشرے کو سنا رہے ہوتے ہیں اور حضورؐ اور صحابہ کرام کی فاقہ مستیوں کا حال بیان کر رہے ہوتے ہیں تو ہمارا اپنا حال یہ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک دن کا فاقہ بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ ہم نے اپنے عالی شان اسلاف کی طرح اپنے کندھوں سے قیمتی اونی چادریں یا کمبل اتار کر کبھی کسی حاجت مند کو نہیں دیئے ہوتے۔ ہم نے اپنے کھانے یا پھلوں کو اٹھوا کر کسی ہمسائے کو' یہ معلوم ہونے پر نہیں بھجوایا ہوتا کہ اُس کے بچے بہت ضرورت مند ہیں۔ ہم لوگوں نے کتنی بیواؤں اور کتنے یتیموں اور طلبہ اور مریضوں کی ضروریات کا کسی درجہ میں انتظام اپنے ذمہ لیا ہوتا ہے۔ جماعت کے فنڈ میں چند روپے جمع کرا کے ہم اس سے فارغ ہو جاتے ہیں کہ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرنی ہے۔

بلکہ ہمارے ہاں سابق روایت یہ تھی کہ جماعتی مناصب پر کام کرنے کے لئے جن لوگوں کی خدمات طلب کی جاتیں وہ خود جماعت ہی سے کہتے کہ جو کچھ آپ مقرر کر دیں' مجھے تو کام کرنا ہے۔ چنانچہ کم سے کم درجے کی ضروریات کا ایک سرسری اندازہ کر کے کسی شخص کا معاوضہ مقرر کر دیا جاتا اور وہ اطمینان سے کام میں محو ہو جاتا۔ روزنامہ تسنیم کی ایڈیٹری کے زمانے میں مصباح الاسلام فاروقی جیسا حساس شخص ایک انقلابی جذبۂ ایثار کے تحت بُھنے ہوئے چنے کھا کر بھی گزارا کرتا تھا۔ بعد میں وہ شعبۂ نشر و اشاعت کے ناظم ہوئے (جو فوجی افسری کو چھوڑ کر آئے تھے) ان کے مقابلے میں آج کا تو ایک دفتری معاون اور ڈرائیور بھی مروجہ معیارات کے مطابق لڑ جھگڑ کر تنخواہیں اور ترقیاں

مانگتے ہیں ـــــ کیوں نہ مانگیں کہ اب ہمارے دفتری نظام میں سکیل اور ترقیاں' اضافے اور بونس سب مقرر ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ دولت کا جادو اتنا زوردار ہے کہ سکیلوں سے بھی بات آگے نکل جاتی ہے۔ پھر وفاتر کی توسیع اور عہدوں اور ملازمتوں کی تکثیر اتنی ہے کہ اس کی وجہ سے "افراد زیادہ اور کام کم" کی صورت پیدا ہو گئی ہے' جبکہ پہلے "افراد کم اور کام زیادہ" کا نقشہ تھا۔ پہلے رضاکار کارکن بہت زیادہ کام کرتے تھے' اب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہر کام کے لئے ہمہ وقتی ملازم بکثرت موجود ہیں' اب ہماری ضرورت نہیں' یعنی ان میں پہلا سا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

---

طریقِ انبیاء پر کام کرنے والوں کے لئے قرآن و حدیث کے سرچشمہ ہائے علم سے مسلسل رابطہ رکھنا اور بڑھانا ضروری ہے۔ اسی ضمن میں جماعت کے عقیدہ' نصب العین' نقشۂ تنظیم اور طریقِ کار کو واضح کرنے کے لئے جو لٹریچر برسوں میں قرآن و حدیث کے دلائل اور اسوۂ نبوت اور خلافتِ راشدہ کے نظائر کی بنیادوں پر تیار کیا گیا ہے' اس کا مطالعہ کرنا دین اور لادینیت کی موجودہ کشمکش اور فرقہ وارانہ چشمکوں اور قسم قسم کی تنظیموں کے رنگ برنگے طور طریقوں کے اس پیچیدہ دور میں نہایت لازم رکھا گیا ہے' اور یہ لٹریچر بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات اور ان تعلیمات کے علمبرداروں کے کارناموں سے ہم کو قریب تر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کی زبان میں دین کے حقائق اور ان کے وسیع تر تصورات سامنے آتے ہیں اور نت نئی الجھنیں صاف ہو جاتی ہیں۔

سالہا سال سے قرآن و حدیث کے لئے سچے جذبۂ وابستگی اور جماعت کے رہنما لٹریچر کے ضروری مطالعہ کے بغیر ہمارے ہاں دستوری اور روایتی طور پر رکنیت نہیں مل سکتی تھی۔ اگر ہم اپنے مختلف اہم معیارات کے ساتھ اس معیار کو بھی نظرانداز کر دیں تو معاملہ رکنیت کے نظام کے درہم برہم ہونے تک ہی نہیں رک جائے گا' بلکہ جاہ و منصب کے نہایت مضبوط معیارات بھی تباہ ہو جائیں گے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو خدانخواستہ نام چاہے آپ جماعت اسلامی سے بھی زیادہ شاندار رکھ لیں اور عددیت کی بڑھوتری آکاس بیل کی طرح زور پر ہو' تب بھی طریقِ انبیاء پر کام کرنا ناممکن ہوگا۔ اور طریقِ انبیاء (خصوصاً اسوۂ خاتم النبیینؐ) سے ہٹ کر کسی راستے پر چلنے سے اقامتِ دین کی منزل تو نہیں مل سکتی' اور بہت کچھ مل سکتا ہے۔

طریقِ انبیاءؑ پر کارِ دعوت کرنے والوں کے لئے ایک شرطِ لازم یہ ہے کہ وہ عملی کردار کے لحاظ سے اپنے عقیدہ' اخلاقی تصورات' تنظیمی معیارات اور اسلامی تہذیبی قدروں کے لحاظ سے ایک خوش آئند اور پُرکشش نمونۂ انسانیت ہوں۔ لوگ ان کو دیکھ کر محسوس کریں کہ یہ ایک اونچا اور پہاڑ آدمی ہے اور اس کے ساتھ چلنا باعثِ عزت!

اچھا پہن لینے اور اچھا کھا لینے' اور اعلیٰ عمارتوں میں جدید ترین سامانوں سے لیس ہو کر بیٹھنے' اکابر سے ملنے' شاندار تقریروں اور تحریروں اور مرعوب کن جلسوں اور جلوسوں سے تحریکِ اقامتِ دین کی اصل قوت نہیں واضح ہوتی۔ اصل قوت تو اس پر منحصر ہوتی ہے کہ کون کتنا راست باز' نصفت شعار اور فیاض ہے؟ کون پاسِ عہد میں کیا مقام رکھتا ہے' کس میں کتنا انکسار اور ایثار ہے' کون دیانت و امانت سے آراستہ ہے' کون اہل خانہ کے ساتھ' ہمسایوں کے ساتھ' ہم سفروں کے ساتھ اور دیگر تمام سماجی رابطوں کے دائروں میں اپنے ایک ایک قول و فعل سے یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ یہ شخص خدا پرستانہ اخلاق کا عکس اپنے اندر رکھتا ہے۔ خصوصیت سے لین دین میں' کاروباری امور میں' حصہ دارانہ مسائل میں عالی ظرف اور قابلِ اعتماد ہے۔ کون اختلافی مسائل میں بحث کرتے ہوئے صبر و تحمل سے گفتگو کرتا ہے' اپنی منوانے کے بجائے دوسروں کی بھی سنتا ہے۔ اور اپنی چیز فقط دلائل کے زور سے منواتا ہے' دھونس یا غصے سے نہیں' اسی طرح دوسروں کی ہر اُس بات کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہے جو وزنی دلائل کے ساتھ آتی ہو۔ وہ دوسروں کو بہ آسانی معاف کر دیتا ہے اور دوسروں سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہے۔ عہد بر ہو تو ساتھیوں سے مساویانہ و برادرانہ طرز پر مشورہ لیتا ہے' لوگ تنقید کریں تو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے۔ پھر اگر سیاست کے میدان میں آئے تو وہ ہر قسم کی چالبازیوں اور مغالطہ انگیز طریقوں سے پرہیز کر کے راست گوئی اور حق بیانی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ دوسرے جو شاطرانہ اور دسیسہ کارانہ انداز کے خوگر ہیں' ان کے ذہنوں اور مکر و فسوں اور طریقِ کار کو سمجھتا خوب ہے' مگر خود شاطرانہ سیاست کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ اول تو اپنے اصول و معیارات کے تحفظ کے لئے مخالفین سے اتحاد نہیں بناتا اور اگر بعض ناگزیر حالات میں ایسا کرنا پڑے تو اپنے غیر متبدل اصول و معیارات کے تحفظ کی گارنٹی پہلے لیتا ہے۔ اتحاد کا معاہدہ کر لینے کے بعد اس میں رخنہ اندازیاں نہیں کرتا۔ ذرا ذرا سے نفع و نقصان یا پسند و ناپسند کی بنا پر دوسروں سے غیر معتدل' غیر حلیمانہ' غیر حکیمانہ اور غیر

صابرانہ طرزِ معاملہ اختیار نہیں کرتا۔ یعنی وقار کے معیار کو چھوڑ کر چھچھور پن کا طریقہ نہیں اپناتا۔ اتحاد کے معاملات میں مارکیٹنگ کی طرح بھاؤ تاؤ (BAR GAINING) نہیں کرتا' اپنی تھوڑی قوت کو زیادہ دکھانے کے لئے'نمائشی مظاہرات کے لئے مسرفانہ اہتمام نہیں کرتا۔ اس طرح کا وسیع دائرہ کردار ہے جو اسلامی تحریک میں درکار ہے۔

---

علوِّ کردار یا با اصولیت کے لئے ذوقِ استعجال بھی تباہ کن ہوتا ہے جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ یعنی جس کام کی جو فطری رفتار کسی معاشرے یا ماحول میں ممکن ہے' اگر آپ اس سے بددل ہو کر یہ چاہیں کہ تیزی سے آپ بڑی طاقت بن جائیں' تیزی سے آپ برسرِ تمکن ہو سکیں اور تیزی سے آپ معاشرے کی سیاسی و معاشی زندگی کے سوِچڑ پر قابو پالیں جبکہ صحیح اصول و کردار کے ساتھ اسلام کے انقلابی جادۂ دعوت پر پیش قدمی کرتے ہوئے ایسا ہونا جلد ممکن نہ ہو تو پھر آپ اس کے سوا اور کیا کریں گے کہ تحریکِ اقامتِ دین کے اصولوں اور طریقِ کار اور طریقِ تنظیم میں تبدیلیاں کریں اور رکاوٹوں اور حدوں کی تعداد روز بروز گھٹاتے جائیں۔ ایسی جلدی کے نتیجے میں اوّل تو ساری مساعی بکھر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے' ورنہ اگر کچھ بنے بھی تو اسلامی نظام تو نمودار نہیں ہو سکتا (ماسوا بعض جزوی اور ناتمام چیزوں کے)' بنے گا تو کوئی اور ہی نظام بنے گا۔ سو ایسا تو ہو ہی رہا ہے' ہم ہوں یا نہ ہوں۔

پس اپنے عقیدہ' نصب العین' طریقِ کار' تشخص اور کردار کی حفاظت ضروری ہے۔ کردار پر ایک حملہ ذاتی خواہشات اور مفاد کا ہوتا ہے اور دوسرا اجتماعی کشمکش کے دباؤ کی وجہ سے' جبکہ کوئی قوت اپنی بساط سے زیادہ بڑی الجھنوں میں کودے یا اقتدار کی سیاسی و انتخابی دوڑ میں اتنی زیادہ محویّت اختیار کرے کہ دین پیچھے سے پکارتا ہی رہ جائے' جیسے حضورؐ نے غزوۂ حنین میں آواز دی تھی کہ "اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ" وہاں تو اتنے اچھے تیار شدہ مردانِ حق تھے کہ پکار سن کر فوراً پلٹے' لیکن ہم جس ماحول کے پروردہ ہیں اور جن قوتوں میں گھرے ہوئے اور جن کمزوریوں کے حامل ہیں' شاید کسی موقع پر دین کی پکار سن ہی نہ سکیں۔ لہٰذا احتیاط!

---

تذکّر کی یہ باتیں دوسروں سے بڑھ کر چونکہ میری اپنی ضرورت ہیں' اس لئے کبھی کبھار ان کو چھیڑ کر اپنے شعور و احساس کا زنگ اتارنے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ باتیں اس لئے ضروری ہیں کہ ہم سب لوگ چاروں طرف سے لادینیّت اور نفس پرستی کے تھاٹھیں مارتے سیلابی پانی کے درمیان گھرے ہیں جو جسموں تک ہی نہیں' دلوں اور دماغوں تک نفوذ کرتا ہے اور ایمان و شعور تک میں جا کر خلط ملط ہو جاتا ہے۔ اور شیاطین اس سیلابِ غلاظت میں پہاڑ جیسی موجیں اچھالتے ہیں۔ ان موجوں سے کوئی پناہ ہے تو تحریکِ اقامتِ دین کے سفینۂ نوحؑ ہی میں ہے۔ اور یہ سفینہ دعوت الی اللہ ہی کے چپوؤں سے اپنے نصب العین کے کوہِ جودی کی طرف رواں رہتا ہے۔

☆☆☆


قرآن کالج لاہور میں

اہم اعلان

## دینی تعلیم کے ایک سالہ نصاب

میں داخلے کے خواہشمند حضرات نوٹ فرمالیں کہ اِن شاء اللہ:

- امسال اس کلاس کا آغاز سابقہ معمول کے برعکس رمضان المبارک کے فوراً بعد ہو جائے گا۔
- درخواستِ داخلہ جمع کرانے کی آخری تاریخ ۲۵ رمضان المبارک طے پائی ہے۔
- داخلے کے لیے انٹرویوز ۲۵ اپریل (اغلباً ۹ شوال) کو ہوں گے۔
- تدریس کا آغاز ۲۷ اپریل (۱۱ شوال) سے ہو جائے گا۔
- یہ کلاس ترجیحاً گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ حضرات کے لیے ہے۔ تاہم استثنائی حالات میں ایف اے پاس امیدواروں کو بھی داخلہ دیا جا سکتا ہے۔

المعلن: ناظم قرآن کالج' ۱۹۱ اے' اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور

## صاف اور صحت بخش خون ہی انسان کی اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔

خون میں فاسد مادّوں کی پیدائش سے پھوڑے پھنسیاں، خارش، دانے اور مہاسے وغیرہ جسم پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔
ہمدرد کی صافی خون کو صاف اور صحت مند رکھتی ہے۔

## صافی کا باقاعدہ استعمال جلدی بیماریوں سے محفوظ رہنے اور خون کی صفائی کا مفید ذریعہ ہے۔

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

# صافی

سے خون بھی صاف
جلد بھی صاف

ہمدرد

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

آوازِ اخلاق
بدزبانی ذہن کا سرطان ہے

# امیرِ تنظیمِ اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے

# پریس ریلیز

## جمعہ ۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء

لاہور۔ ۲۲ر فروری ... امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ام المحارب یعنی جنگ و جدال کے سلسلے کا وہ پہلا مرحلہ واقعی شروع ہو چکا ہے جس کے بعد خونریز جنگوں کے دو اور سلسلے درپیش ہوں گے اور اس کے بعد ہی غلبۂ اسلام کا وہ دور آنے والا ہے جس کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی لیکن ان سلسلوں اور مراحل کے دورانئے اور ان کے مابین وقت کے فاصلوں کا تعین کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں جامع القرآن کے اجتماعِ جمعہ سے خطاب کر رہے تھے جو تنظیم اسلامی پاکستان کے سولہویں سالانہ اجتماع کا افتتاحی اجلاس بھی تھا۔ انہوں نے کہا کہ خود صدام حسین کو یا اس کے کسی قریبی ساتھی کو قرآن مجید اور احادیث شریفہ سے گہرا شغف ہے جو "ام المحارب" جیسی اصطلاح اور عراقی صدر کی تقاریر و بیانات کے بعض حصوں سے جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بظاہر خلیج کی جنگ کا آغاز عراق کی کویت پر جارحیت ہی سے ہوا اور ہمارا ریڈیو اور ٹی وی دن رات یہی ایک راگ الاپ رہا ہے بلکہ ہمارے وزیر اعظم دس بارہ ملکوں میں جا کر بھی اسی کا ڈھنڈورہ پیٹ آئے لیکن اس کے پیچھے امریکی سازش یا "واسپ" یعنی وائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ کی منصوبہ بندی اور اس کی پشت پر صیہونیت کے عزائم صاف نظر آتے ہیں اور ایک مسلمان تو وہ مشیتِ خداوندی بھی دیکھ سکتا ہے جو سب اسباب سے بڑا سبب ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ صیہونیت صرف عالم اسلام کے سینے پر اپنے پنجے گاڑنے پر قناعت نہ کرے گی کیونکہ اس کے پروگرام میں دنیا کی سب ہی بڑی قوتوں کو زیر کرنا شامل ہے۔ روس کو بکھیر دینا' خود امریکہ کے ٹکڑے کر دینا' بھارت کو توڑنا اور چین کے بھی حصے بخرے کرنا اسی پروگرام کے مختلف مراحل ہیں تاہم ہمارے نزدیک صیہونیت کی اولین کامیابی یعنی اسرائیل کا وجود میں آنا بھی صیہونی منصوبے کا نقطہ آغاز نہیں بلکہ اس آخری عذاب کی تمہید ہے جو اللہ پر قرض ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جسے چکانے کے لئے دنیا میں تشریف لائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہودی دنیا بھر سے سمٹ کر ایک

جگہ جمع ہو رہے ہیں تاکہ ایک ہی جگہ ان کا قبرستان بنے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ملت ابراہیمی کے سب اجزاء یعنی مسلمان' یہودی اور عیسائی تینوں اپنے اپنے مسیح کے انتظار میں ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مسیح تو ایک ہیں لیکن یہودیوں کا واسطہ مسیحا سے نہیں بلکہ دجالِ اکبر سے پڑے گا۔ انہوں نے کہا کہ غلبۂ اسلام سے پہلے مسلمانوں کو طویل اور صبر آزما مرحلوں سے گزرنا ہوگا اور اس دورِ پُر فتن میں ان کے کرنے کا کام بہرحال یہ ہے کہ ایمان کی دعوت کو عام کریں' مسلمانوں میں بھی اور غیر مسلموں میں بھی۔ اور چونکہ زمانہ اب بہت ترقی کر چکا ہے لہٰذا ایمان کی دعوت کا ذریعہ قرآن حکیم کو بنانا ہوگا جو ذہانت کی اعلیٰ ترین سطح پر فائز لوگوں کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ امت مسلمہ کا یہی لائحہ عمل ہے جسے ترک کرنے کی سزا عرب بھگت رہے ہیں اور ہم خود بھی زیادہ دیر بچے نہ رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں نہ صدام سے محبت ہے نہ سعودی عرب سے کوئی عداوت لیکن کویت کے حکمرانوں کے طرز عمل کی جو تفصیلات اخبارات و جرائد میں آ رہی ہیں انہیں دیکھ کر یاد آ جاتا ہے کہ آج ایران سے اظہار یگانگت کرنے والے سعودی عرب میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ایرانیوں کی تکفیر کا فتویٰ جاری ہو رہا تھا اور اگر ترکی کا وفد اس کی مخالفت میں ڈٹ نہ جاتا تو یہ جاری ہو کر رہتا۔ انہوں نے کہا کہ جن لوگوں کے نزدیک عراقی صدر کل عرب کا مجدد تھا انہیں آج صدام حسین کو اسلام کا دشمن قرار دینا زیب نہیں دیتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے کہا کہ اس کی ناکامی تو ظاہر ہو چکی ہے لیکن ہماری سیاسی قیادت کے پاس شاید کوئی متبادل بھی موجود نہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ نے برملا ہمیں ناقابل اعتماد قرار دے دیا ہے اور اس وقت جبکہ خلیج کے بحران میں ساتھ نبھانے والے دوسرے مسلمان ملکوں پر خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں' ہمیں ہمنوائی کرنے اور فوج تک بھیج دینے کے بعد بھی دہاڑی دار سے زیادہ نہیں سمجھا گیا۔ ہماری اجرت پچاس ہزار بیرل تیل یومیہ مقرر ہوئی ہے اور وہ بھی تین ماہ کے لئے۔ بعد میں خدا ہی جانے کیا ہوگا۔

## جمعہ یکم مارچ ۱۹۹۱ء

لاہور۔ یکم مارچ ... امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ خلیج کی گرم جنگ کے اختتام پر ایک نئی سرد جنگ کا آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔ روس سجدے سے سر اٹھاتے ہوئے رکوع کی حالت تک آ چکا ہے اور بھارت کے بالفعل وزیر اعظم راجیو گاندھی کا تہران اور وہاں سے ماسکو کا سفر عالمی سیاست میں ایک نئے رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ مسجد دارالسلام

باغ جناح میں اجتماع جمعہ سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ پچھلے دنوں ملک کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کے مطالبے نے زور پکڑا لیکن میں نے اس کی ہمنوائی نہ کی کیونکہ کوئی متبادل راستہ نظر نہ آتا تھا تاہم حالات کی نئی کروٹ نے اب سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ سرد جنگ کے اس نئے دور میں امریکہ کی نظر التفات اگرچہ ایک بار پھر پاکستان کی طرف بھی ہو جائے گی مگر ہم بارہا تجربہ کر چکے ہیں کہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے اسے دیر نہیں لگتی چنانچہ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد اب امریکہ جیسی ناقابل اعتماد سپر پاور کی مصلحت اور سعودی عرب و امارات وغیرہ کی پیروی پر نہیں رکھنی چاہئے جو پہلے بھی امریکہ کے ڈھکے چھپے ایجنٹ تھے اور اب تو وہی ان کا مائی باپ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہم لوگوں نے نصرانیوں کی دوستی کو روسی ملحدوں سے تعلق پر ترجیح دی کہ وہ آخر تو اہل کتاب ہیں اور پھر روسی کمیونزم بھی کسی حال میں ہمارے لئے قابل قبول نہ تھا مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ روس میں کمیونزم دم توڑ گیا اور وہاں سوشلزم ہی باقی رہ جائے گا جس کے ساتھ مذہبی آزادی دیئے جانے کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ہمارے قومی مفادات کا تحفظ اب ایک ایسی آزاد خارجہ پالیسی میں ہے جسے روس اور بھارت سے بھی باعزت دوستی اور برابری کی بنیاد پر دو طرفہ تعلقات سے متوازن بنایا جائے۔ روس' بھارت اور ایران کی ابھرتی یک جہتی سے بھی ہمیں یہی اشارہ ملتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ روس میں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں جن میں مذہبی آزادی ملنے کے بعد اسلام کا احیاء ہو سکتا ہے اور یہ بھی فراموش نہ کیا جائے کہ بھارت میں بیس کروڑ مسلمان بستے ہیں اور اتنے مسلمان یکجا کسی مسلم ملک میں بھی موجود نہیں۔ قبل ازیں ڈاکٹر اسرار احمد نے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ جنگ بندی سے برادر مسلم ملک عراق مکمل تباہی سے بچ گیا' صدر صدام حسین' اس کی قوم اور فوج کو سلام پیش کیا جنہوں نے اٹھائیس ملکوں کے سامنے چھ ہفتے تک ڈٹے رہ کر دکھا دیا جن میں امریکہ' برطانیہ اور فرانس جیسے اعلیٰ ترین جنگی طیارے اور جدید ترین سامان حرب رکھنے والے ممالک بھی شامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے صدام کو کبھی صلاح الدین ایوبی سے تشبیہ نہیں دی اس کے برعکس عراقی صدر کے بعض پس منظر پر پوری وضاحت سے روشنی ڈالی تھی لیکن اس کی ہمت اور آخر میں حالات سے سمجھوتہ کر لینے کی صلاحیت کو داد نہ دینا زیادتی ہے۔ آخر وہ بھی تو ہٹلر کی طرح اپنی قوم کو تباہی کے دہانے پر پہنچا کر خودکشی کر سکتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں خود بھی بیس سال پہلے ایسے ہی حالات کا سامنا تھا۔ عراق کی افتاد کو ۱۹۷۱ء کا "ایکشن ری

پلے" کہا جا سکتا ہے جس میں مغربی پاکستان بھی بھارت کے لئے چند دن کی مار رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے یاد دلایا کہ اللہ کی مشیت کے علاوہ جس طرح اس وقت تکسن کی اندرا گاندھی کو دھمکی کارگر ہوئی تھی ویسے ہی آج صدر بش نے بادل ناخواستہ جنگ بند کی تو اس میں گورباچوف کی طرف سے انتباہ کا دخل ہے جسے ذرائع ابلاغ نے زیادہ نمایاں نہیں کیا۔

---


HOUSE OF QUALITY BEARINGS

**KHALID TRADERS**

*IMPORTER, INDENTOR, STOCKIST, SUPPLIER,*
*OF ALL KINDS OF BALL, ROLLER & TAPER BEARINGS*

**WE HAVE :**
- BEARINGS FOR ALL INDUSTRIES & MARINE ENGINES.
- AUTOMOTIVE BEARINGS FOR CARS & TRUCKS.
- BEARINGS UNIT FOR ALL INDUSTRIAL USES.
- MINIATURE & MICRO BEARINGS FOR ELECTRICAL INSTRUMENTS.

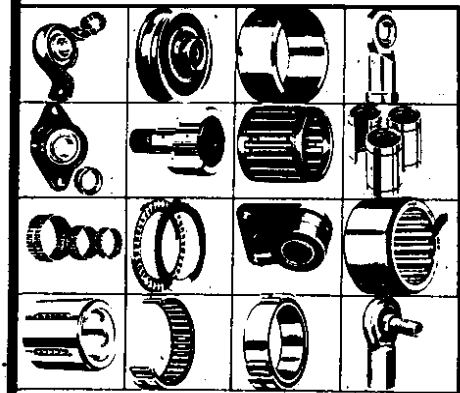

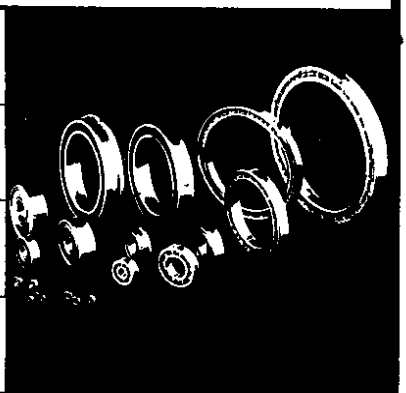

**PRODUCTS**

EZO HIGH PRECISION

*MINIATURE BEARINGS*
*EXTRA THIN TYPE BEARINGS*
*FLANGED BEARINGS*
*BORE DIA .1 mm TO 75 mm*

**DISTRIBUTOR**

ROD KBC EZO

**STOCKIST**

NACHI NSK SKF NTN

**CONTACT : TEL. 732952 - 735883 - 730595**
**G.P.O BOX NO.1178.OPP KMC WORKSHOP**
**NISHTER ROAD, KARACHI - PAKISTAN**
**TELEX: 24824 TARIQPK. CABLE: DIMAND BALL.**

# ہم مغرب سے مقابلہ کرتے ہیں

## .... اور اُن ہی کی سرزمین پر!

ہم اپنے گارمنٹس بیڈلنن اور ٹیکسٹائل کی دیگر مصنوعات مغربی ممالک، اسکینڈی نیوین ممالک، شمالی امریکہ، روس اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور ہماری برآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن بیرونی منڈیوں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہمیں انتھک محنت کرکے اپنی فنی مہارت اور معلومات میں مستقل اضافہ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ ایسی محنت جو ہمیں تھک کر دم نہیں لینے دیتی ایسی محنت جو ہماری کارکردگی کے معیار کو اور بلند کرتی ہے، ایسی محنت جو کوالٹی، ڈیزائن اور پابندیٔ وقت کے سلسلے میں کرم فرماؤں کے مطالبات اطمینان بخش طریقے پر پورا کرنے کا ہمیں اہل بناتی ہے۔

Made in Pakistan
Registered Trade Mark

**Jawad**

جہاں شرط مہارت
وہاں جیت ہماری

معیاری گارمنٹس تیار کرنے اور برآمد کرنے والے

## ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز (گارمنٹس) پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

IV/C/3-A ناظم آباد کراچی - 18 - پاکستان - فون 610220-616018-628209

کیبل "JAWADSONS" ٹیلیکس 24555 JAWAD PK فیکس 610522 (92-21)

MONTHLY
# Meesaq
LAHORE

Regd.L.No 7360
VOL. 40 NO 3
MARCH 1991